رجسٹرڈ نمبر اے ۶۶۴

نگار

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰ر

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کردینے والی
انجیل انسانیت
من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبری و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔
ضخامت ۶۰۲ صفحات، مجلد نو روپیہ لعہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
کا
مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:- اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ جن کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس و دہان ہی حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود و غیرہ
ضخامت ۶۲۳ صفحات کاغذ سفید، قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں و مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کیسی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

غلطی کی تصحیح	مضمون "ہندوستان کی آبادی" (صفحہ ۴۲) کی میزان میں غلطی ہوگئی ہے دراصل کل آبادی ۳۶۰۷۴۳۹۴ ہے اور مسلم آبادی ۳۶۴۷۷۸۴۱۴۱ ہے

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

مئی کے "نگار" میں ہم کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ نگار کا آیندہ سالنامہ

"فرمانروایان اسلام" نمبر ہوگا

اور اس کی بعض خصوصیات کو بھی ظاہر کر چکے ہیں، لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے بعض حضرات اس کی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکے ہوں، ہم مکرر اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ سالنامہ دراصل "تاریخ اسلامی" کا نچوڑ ہوگا، جس میں ولادتِ رسول اللہ سے لیکر اس وقت تک کی تمام چھوٹی بڑی مسلم حکومتوں کا ذکر ہوگا جو ۱۳ سو سال کے اندر تمام کرۂ ارض پر رونما ہوکر فنا ہوگئیں یا اب بھی باقی ہیں۔ اس میں ان تمام حکومتوں کے اسباب قیام و عروج اور انحطاط و اختتام کے ذکر کے ساتھ، تمام حکمرانوں کے نام، ان کی حکومت کی مدت بقید سن ہجری و عیسوی درج ہوگی اور یہ بتایا جائے گا کہ ایک ہی خاندان سے اور کتنے خاندان پیدا ہوئے، انھوں نے کہاں کہاں حکومتیں کیں اور ان کا کیا حشر ہوا۔

مسلمان اپنے زمانۂ عروج میں یوروپ، ایشیا، افریقہ کے ان بعید ترین گوشوں تک پہونچ گئے تھے جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کا علم بہت کم حضرات کو ہے۔ نگار کے اس سالنامہ کے ذریعہ سے تاریخ اسلام کی انھیں مفید و دلچسپ معلومات کو پیش کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ دو نقشے ایسے پیش کئے جائیں گے جن کو دیکھ کر مسلمانوں کے عروج و زوال کی تصویر آپ کے سامنے آجائے گی۔

یہ پورا سالنامہ خود اڈیٹر نگار مرتب کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ہم پہلی جنوری ۱۹۵۴ء تک اسے شایع کر سکیں گے اس کی ضخامت کا صحیح اندازہ ابھی نہیں ہوسکتا۔ اس کی بابت غالباً ہم آیندہ کچھ کہہ سکیں گے۔ امید ہے کہ آپ اس کی توسیع اشاعت میں ضرور حصہ لیں گے اور اپنے حلقۂ احباب، مدارس کے طلبہ و اساتذہ کو بھی اس سالنامہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کریں گے۔

یہ سالنامہ دراصل ایک مستقل کتاب ہوگی اور کتاب ہی سمجھ کر اس کو حاصل کرنا چاہئے۔

جو حضرات نگار کے خریدار نہیں ہیں اور صرف سالنامہ ہی لینا چاہیں گے ان کے لئے اس کی قیمت (علاوہ محصولڈاک) تین روپیہ ہوگی۔

ایجنٹوں کو اپنا آرڈر جلد دیدینا چاہئے، تاکہ اسی حساب سے اس کی کاپیاں زاید طبع کرائی جائیں۔

آیندہ اشاعتوں کے بعض نہایت اہم و دلچسپ مضامین

اس ماہ کی اشاعت سے محمد اسحاق صاحب صدیقی کی "فنِ تحریر کی ایجاد" کی نہایت دلچسپ و مفید مضمون کا سلسلہ شروع ہوا ہے، یہ مضمون صرف تمہید ہے۔ محمد اسحاق صاحب صدیقی آیندہ جولائی کی اشاعت میں بتائیں گے کہ فن تحریر کی ایجاد سے قبل انسان کیونکر تبادلۂ خیال و اظہار جذبات کرتا تھا، اور اس مقصد کے لئے کتنے عجیب و غریب طریقے انسان نے پیدا کئے تھے، اسی سلسلہ میں وہ زمانۂ قدیم کے تصویری رسم خط کا ذکر کریں گے، جو پیکانی، ہیراغلفی (مصر) چینی، جاپانی اور وادی سندھ کی تحریروں پر مشتمل ہوگا۔ اور اس کے بعد وہ حروف کی ایجاد اور ان کی نشر و اشاعت سے بحث کریں گے جو سامی، یونانی اور براہمی شاخوں کے رسم خط سے متعلق ہوگی۔

اخیر میں وہ آلات و ذرایع تحریر یعنی کاغذ، سیاہی و قلم وغیرہ کی ایجاد پر روشنی ڈالیں گے۔ یہ سلسلہ دسمبر ۵۳ء تک ختم ہوجائے گا۔ جناب محمد اسحاق صدیقی کا ایک سلسلۂ مضامین اعداد و حروف ہجا پر بھی ۴۸ء کے متعدد پرچوں میں شایع ہوچکا ہے جسے ارباب علم نے بہت پسند کیا۔ اب یہ نیا سلسلہ اس سے زیادہ دلچسپ و مفید ہے اس لئے ہمیں امید ہے کہ قارئین نگار اس سلسلہ کے تمام مضامین کو جو بیش بہا معلومات پر مشتمل ہوں گے اپنے پاس محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس مقالہ کے علاوہ بعض نہایت دلچسپ اور ادبی مقالے مومن، حالی اور درد پر بھی سلسلہ وار شایع ہوں گے۔

پاکستان کے خریدارانِ "نگار"

از راہ کرم مدت خریداری ختم ہونے پر بغیر کسی تقاضہ و یاد دہانی کے اپنا چندہ ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ پر بھیجدیا کریں اور رسید منی آرڈر جو ڈاک خانہ سے ملتی ہے اسے ہمارے پاس براہ راست ہمارے پاس بھیجدیں۔ اس طرح ان کو پرچہ بروقت اور جلد ملتا رہے گا۔ آپ کو چندہ کے اختتام کی اطلاع نگار ہی کے ذریعہ سے دیجاتی ہے۔ اگر آپ نگار کے صفحہ فہرست پر داہنی طرف صلیب کا نشان دیکھیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کا چندہ ختم ہوگیا اور اولین فرصت میں منی آرڈر روانہ کردیں

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی - کراچی

(مطبوعات نگار بھی اسی پتہ سے مل سکتی ہیں)

منیجر نگار لکھنؤ

ایک غلطی کا ازالہ:۔ پچھلے مہینے تلق میرٹھی پر جو مقالہ شایع ہوا ہے، اس میں ایک بڑی غلطی پائی جاتی ہے وہ یہ کہ سید تمکین کاظمی صاحب نے ایک جگہ لکھدیا ہے کہ یہ مشہور مصرعہ۔ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"۔ تلق کا ہے۔ حالانکہ یہ مصرعہ درد کا ہے۔ افسوس ہے کہ مسودہ کو غور سے دیکھے بغیر میں نے کاتب کے حوالہ کردیا۔ (نیاز)

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ جون میں ختم ہوگیا اور جولائی کا
"نگار" آٹھ روپیہ سات آنے میں وی پی ہوگا جس میں سالنامہ ۵۴ء کی قیمت بھی شامل ہے

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۳ | فہرست مضامین جون ۵۴ء | شمار ۶

ملاحظات ---------------------- ۲
اکبرالہ آبادی پاکستان اور ہندوستان کی نظر میں... گوپی چندر نارنگ - ۶
علوم و معارف... (ڈاکٹر) سعید حسن (الہ آباد یونیورسٹی) --- ۱۲
فن تحریر کی تاریخ ---- محمد اسحاق صدیقی -------- ۱۹
یادرفتگاں ------- کلب علی خاں فائق -------- ۲۴
ڈالر اور اسٹرلنگ --- (ترجمہ) عائشہ (ایم - اے) --- ۳۱
گاہے گاہے بازخواں! ------------ ۳۵
ہندوستان کی آبادی (۱۹۵۱ء) ---------- ۴۱
مومن کا تغزل ---- نظیر صدیقی ------- ۴۳
اِدھر اُدھر سے ------------ ۴۸
منظومات.. فضا ابن فیضی - پروفیسر شور - تنویر احمد - جگر بریلوی --- ۵۲

ملاحظات

حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ

میرے ایک قدیم کرمفرما ہیں میری ہی عمر کے لیکن بالکل مجرد، زن و اولاد کے جھگڑے سے آزاد، نہایت زندہ دل، بڑے دلچسپ اور چونچال قسم کے انسان۔ ایک ہاتھ میں سونٹا۔ دوسرے میں تسبیح، بغل میں اخبار۔ سر برہنہ، جسم پر صرف کرتہ تہمد۔ یہ ہے ان کی وضع و ہیئت جو ان کی زندگی کا لازمی جزو بن گئی ہے۔ ان کا تنہا مشغلہ صرف اخبار دیکھنا ہے اور کبھی کبھی اپنے احباب کے پاس بیٹھ کر ان پر تبصرہ کرنا۔

کل شام کو وہ مجھ سے ملنے آئے تو کچھ مضمحل سے تھے۔ میں نے پوچھا "میر صاحب آپ اُداس سے کیوں ہیں، خیر تو ہے"۔ بولے، "کیا پوچھتے ہو اسی خیر نے تو سارا کام بگاڑ رکھا ہے" میں کچھ سمجھا نہیں اور ان کا منھ تکنے لگا۔ کہنے لگے:۔ "دیکھتے ہو آجکل زمانہ کا رنگ!۔ اخبار کیا دیکھتا ہوں بے نمک کی اُبلی ہوئی ترکاری کھاتا ہوں۔ جدھر دیکھو امن، سکون، شانتی کی پکار ہے، معلوم نہیں یہ "شانتی" ان مسخروں کی کیا لگتی ہے کہ ہر وقت اسی کا نام زبان پر رہتا ہے، کوئی پوچھے ان احمقوں سے کہ اگر آج ہر جگہ امن ہی امن ہو جائے تو دنیا رہنے کے قابل کب رہے، وہ تو کہئے انتظام خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ امن قایم ہونے نہیں دیتا ورنہ یہ دُنیا والے تو کبھی کا کرۂ ارض کو تباہ و ویران کرکے رکھدیتے۔ ہائے ہائے، کیا شان خداوندی ہے، جل جلالہٗ، ایک طرف اس نے یہ کہا:۔ لوگو، مسجدیں بناؤ، مندر تعمیر کراؤ، خانقاہیں قایم کرو، دوسری طرف اوروں سے کہتا کہ مسجدیں ڈھاؤ، مندر مسمار کرو، خانقاہیں لوٹو۔ چلئے قصہ ختم ہوا اور دنیا کی رونق ہمیشہ کے لئے قایم ہوگئی۔ بھئی بُرا ماننا لیکن سچ کہتا ہوں کہ نہرو مجھے بالکل پسند نہیں، جہاں کہیں لڑائی کا خطرہ ہوگا، یہ حضرت ضرور امن کا جھنڈا لیکر سامنے آجائیں گے، کوئی پوچھے کہ آپ کو پرائے پھٹے میں پاؤں ڈالنے سے کیا فایدہ آپ کو کیا اگر کوریا کی لڑائی بند نہیں ہوتی، آپ کو کیا تکلیف ہے اگر چین کو یو۔ این۔ او میں شامل نہیں کیا جاتا۔ اور تو اور۔ اب آپ مصر و برطانیہ کا جھگڑا طے کرانے

کی فکر میں ہے۔ اس سے زیادہ کھُلی ہوئی بغاوت خدا سے اور کیا ہو سکتی ہے"۔

میں نے کہا کہ:۔ "آپ تو اسٹالین کی بڑی تعریف کرتے ہیں، لیکن امن کی آواز تو اس نے بھی بلند کی تھی"۔ بولے :۔ "اس میں شک نہیں مجھے اسٹالین بہت پسند تھا اور گو اس نے بھی "امن" کی آواز بلند کی تھی لیکن یہ آواز اس کے منہ کچھ دھواں دیتی ہوئی نکلتی تھی اور اس کی کسی بات کا دنیا کو یقین نہ آتا تھا۔ مالنکوف کے تیور کچھ اور ہیں اور یہ احمق غالباً سچ مچ امن کا خواہاں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ تو کہئے کہ اسٹالین کی دھاک ابتک بیٹھی ہوئی ہے اور دُنیا کو مالنکوف میں بھی اسٹالین ہی کا بھوت نظر آتا ہے، ورنہ یہ کوریا کے جھگڑے کا چراغ بھی گُل ہو جاتا اور دنیا بالکل تاریک ہو جاتی"۔

میں نے کہا :۔ "میر صاحب، یہ تو خیر اس دُنیا کی باتیں ہیں جس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ آپ تو یہ بتائیے کہ ہندوستان و پاکستان کے موجودہ حالات کو آپ کیسا سمجھتے ہیں"۔

چھوٹتے ہی بولے :۔ "بہت بُرا، اپریل تک تو پاکستان کے حالات کافی امید افزا تھے، لیکن اب وہاں بھی سناٹا ہے، لاہور کی فوجی حکومت ختم ہو گئی اینٹی احمدی تحریک دب گئی۔ لوگوں کی سزائے موت کو قید میں بدل دیا گیا، ناظم الدین کو معزول کر دیا اور وزیر اعظم بنا دیا محمد علی کو جس نے انتظام ہاتھ میں لیتے ہی کہہ دیا کہ "نہرو میرے بڑے بھائی ہیں" گویا نہرو بھی کوئی ایسی چیز ہیں جن کے بھائی بننے پر فخر کیا جا سکتا ہے"۔

میں نے پوچھا "کیا نہرو کو بھی آپ اچھا نہیں سمجھتے"۔ میر صاحب بولے :۔ "بڑے اچھے، کیا کہنا، یہ امن کا سارا فساد تو انھیں کا لایا ہوا ہے، نہرو وہی تو ہیں جنھوں نے سب سے پہلے "ناجنگی" کی تحریک پاکستان کے سامنے پیش کی اور ناظم الدین نے اس پر کان نہ دھرا، غالباً یہ تحریک بھی نہرو ہی کی تھی کہ کشمیر کا مسئلہ آپس میں گفتگو کر کے طے کر لیا جائے، لیکن جب تک لیاقت علی خاں زندہ رہے وہ اس کے جواب میں گھونسہ دکھاتے رہے اور ان کے بعد جب ناظم الدین آئے تو انھوں نے بھی اس پر کوئی توجہ نہ کی۔۔۔ لیکن اب محمد علی صاحب تشریف لائے ہیں تو یہ سارا کیا دھرا خاک میں ملا دینا چاہتے ہیں، عبدالقیوم خاں سے البتہ کچھ امیدیں وابستہ ہیں، لیکن غریب تنہا وہ کیا کر سکتا ہے۔ مجھے تو محمد علی پر حیرت آتی ہے کوئی ان سے پوچھے کہ بندۂ خدا، پاکستان و ہندوستان میں اگر میل ہو گیا تو پھر بقول میر "منہ پر دوپٹہ تان کر سو رہنے" کے علاوہ اور کیا کام رہ جائے گا۔ لوگ آزادی کے ساتھ ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان آنے جانے لگیں گے، ریلیں جاری ہو جائیں گی، پاسپورٹ کی دشواریوں میں کمی ہو جائے گی، آپس کی تجارت آسانی سے ہونے لگے گی متروکہ جایدادوں کے جھگڑے طے ہو جائیں گے۔ لیکن یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ سوئی ہوئی، ویران، سنسان! ۔ انسان کی ذہنیت خطرہ ہی کے ساتھ بیدار ہوتی ہے اور خطرہ دور ہوتے ہی سو جاتی ہے، سائنس ہمیشہ تلواروں ہی کے سایہ میں ترقی کرتی ہے۔ اگر پچھلی دو لڑائیاں نہ ہوئی ہوتیں، تو قدرت کے بہت سے چھپے ہوئے راز بدستور چھپے رہتے، نہ فنِ پرواز میں ترقی ہوتی، نہ نئے نئے عناصر دریافت ہوتے، نہ جوہری قوت کا علم لوگوں کو حاصل ہوتا۔"

میں نے ان کو روک دیا کیونکہ اب انھوں نے سائنس پر لکچر شروع کر دیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ جب اس موضوع پر ان کی زبان ایک بار کھل جاتی ہے تو مشکل سے رُکتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ :۔ "میر صاحب، آپ موضوع سے ہٹے جاتے ہیں، میں تو صرف ہندوستان و پاکستان کی سیاسیات پر آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں"۔ یہ کہکر ان کا جوش ٹھنڈا ہوا اور ایک آہ سرد کے ساتھ فرمایا کہ :۔ "بھئی میں کیا رائے دوں، مجھے تو اب آثار بہت بُرے نظر آتے ہیں۔ پاکستان میں جو سردی پیدا ہو گئی ہے اس کا حال آپ کو معلوم ہی ہے، وہاں سے کوئی ایک خبر بھی ایسی نہیں آتی جس سے ان کی زندگی کا پتہ چلے۔۔۔ ہندوستان کے اندر البتہ اس دوران میں مہاسبھائیوں اور جن سنگھیوں کی طرف سے کچھ امیدیں قایم ہو چلی تھیں، لیکن وہ بھی کچھ نہ نکلے :۔۔۔

یہ حسینانِ جہاں بھی دلربا کہنے کو ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔"

میں نے پوچھا :۔ "میر صاحب، اگر آپ کو پاکستان کا وزیر اعظم ۔۔۔ یا فرمانروا بنا دیا جائے تو آپ کیا کریں"۔

جوش میں آکر بولے :۔ "سب سے پہلے تو میں ان لوگوں کی سزائے قید کو جن کو فوجی قانون نے سزائے موت دی تھی، پھر سزائے موت میں تبدیل کر دوں تاکہ ملک میں شورش و اضطراب کی لہر دوڑ جائے اور پاکستانی فوج و پولیس جو پڑی ہوئی اُدگھ رہی ہے، پھر چونک پڑے۔ اس کے بعد کشمیر کے مسئلہ کو سکورٹی کونسل سے ہٹا کر ہندوستان کو مقابلہ کا کھلا ہوا چیلنج دیدوں تاکہ برسوں سے جو یہ گھِس گھِس ہو رہی ہے کسی طرح ختم ہو۔۔۔"

میں نے پوچھا :۔ "اور اگر آپ کو اس لڑائی میں شکست ہو گئی تو پھر کیا ہو گا"۔

بولے :- " جو کچھ بھی ہو - لڑنے والے یہ نہیں سوچا کرتے، ان کا مسلک صرف یہ ہے کہ :

آنکس کہ جاں ستاند و جاں می دہد یکے ست

میں نے کہا :- " میر صاحب، آپ تو غالباً نسلاً سید ہیں "

بولے :- " غالباً، کیا یقیناً "

میں نے پوچھا :- " آپ انھیں علویین کی نسل سے تو نہیں جو صرف حاجیوں کے قافلے لوٹ لوٹ کر زندگی بسر کرتے تھے، ہوسکتا ہے کہ آپ حسنوی خاندان کے حسین بن علی کی اولاد میں سے ہوں جس نے مدینہ پر حملہ کرکے اسے تباہ کردیا تھا، یا حسین الافطس اور ابراہیم بن موسیٰ کی نسل سے تعلق رکھتے ہوں، جن کا سب سے بڑا کارنامہ کعبہ کو لوٹ لینا تھا " میر صاحب نے نہایت حسرت سے فرمایا :" کاش میں انھیں میں سے ہوتا " اور اٹھ کر چلے گئے -

---

انجمن ترقی اُردو ہند کا ایک بڑا کارنامہ

ہماری قوت عمل اس قدر ضعیف ہوگئی ہے کہ اول تو کسی کام کا ارادہ ہی نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی جائے تو اس کا پورا ہونا گویا " ہفت خوان " طے کرنا ہے - جس وقت انجمن ترقی اُردو نے اُردو کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ یو- پی کے اُردو بولنے والوں میں سے کم سے کم ۲۰ لاکھ آدمیوں کے دستخط حاصل کرنا ضروری ہیں تو اس وقت میں بھی اس جلسہ میں شریک تھا، لیکن مجھے یقین نہ تھا کہ انجمن اس کام کو پورا کرسکے گی۔

اس کے لئے نہ صرف روپیہ کی ضرورت تھی بلکہ پُرجوش کام کرنے والوں کی بھی اور میں ان دونوں کی کمی محسوس کرتا تھا، لیکن خیر، یہ تجویز کاغذ پر آگئی اور اسلوب کار کے لئے ایک کمیٹی مقرر کرکے اس کا اہتمام و انصرام حیات اللہ صاحب انصاری کے سپرد کردیا گیا۔ یہ کئی مہینے اس طرف کی بات ہے۔

اس دوران میں اس کام کی تکمیل کے لئے حیات اللہ صاحب اور ان کی بیگم نے کیا کیا تدابیر اختیار کیں، کس طرح کام شروع کیا گیا، اسے کیونکر آگے بڑھایا گیا، تقسیم عمل کے لئے وہ مختلف اضلاع وقصبات میں ۰۰۸ شاخیں قایم کرنے میں کیسے کامیاب ہوگئے، روپیہ کہاں سے آیا، کام کرنے والے کس طرح پیدا ہوگئے، یہ ایک بڑی داستان ہے اور اب کہ یہ کام پورا ہوچکا ہے اور ۲۰ لاکھ سے زیادہ دستخط حاصل ہوچکے ہیں، غالباً اس کے شرح و بیان کی ضرورت بھی نہیں - لیکن غالباً ناشکری ہوگی اگر ان لوگوں کی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے، جن کی سعی و کوشش سے یہ کام انجام تک پہونچا۔

لکھنؤ کی انجمن ترقی اُردو کے صدر پنڈت کشن پرشاد کول ہیں اور جنرل سکریٹری حیات اللہ صاحب انصاری اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر یہی عہدے ان کی جگہ کسی اور کے سپرد ہوتے تو اس کام کا تکمیل تک پہونچنا ممکن نہ ہوتا - ان دونوں حضرات نے جس جوش و خلوص، جس نظم و ترتیب کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیا اس کی مثالیں ہم کو دُنیائے عمل میں بہت کم ملتی ہیں -

۲۰ لاکھ دستخط حاصل کرلینا، یوں تو بظاہر کہنے میں بہت آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن جب کرنے پر آئیے تو پتہ چلے کہ عملی حیثیت سے یہ کس قدر دشوار ہے اور اگر کسی نہ کسی طرح دستخط حاصل کر بھی لئے جائیں، تو ان کو دفتری تہذیب و سلیقہ کے ساتھ ایک قابل اعتماد دستاویزی شکل میں لے آنا کس قدر صبر آزما کام ہے - لیکن آپ کو یہ سُنکر حیرت ہوگی کہ آٹھ سو شاخوں سے خط و کتابت کرنے، ان کو وقتاً فوقتاً ہدایات دینے، تبلیغی لٹریچر فراہم کرنے، ان کے کام کا احتساب کرتے رہنے اور پھر مرکزی دفتر میں تمام کاغذات کو باقاعدہ مرتب رکھنے کی تمام تر ذمہ داری ایک خاتون (بیگم حیات اللہ انصاری) نے اپنے سر لی اور ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ اسے انجام دیا کہ شاید حکومت کا کوئی سکریٹری بھی اس طرح انجام نہ دے سکتا۔

اس وقت درجنوں کلرک ہیں جو ان کے زیر ہدایت کام کر رہے ہیں اور ریکارڈ کے فایل کامل تنقیح کے بعد الماریوں میں حفاظت کے ساتھ رکھے جارہے ہیں تاکہ انھیں عرضداشت کے ساتھ صدر جمہوریہ کے سامنے پیش کیا جائے۔

اب دستخطوں کے حاصل کرنے کا سلسلہ بند کردیا گیا ہے اور جو کام ہوچکا ہے اس کو سمیٹا جارہا ہے، عرضداشت کا مسودہ بھی مرتب ہوچکا ہے اور ایک وفد اس عرضداشت اور ریکارڈ کو لے کر صدر جمہوریہ کی خدمت میں جانے والا ہے - ہمیں امید ہے کہ اُردو علاقائی زبان تسلیم کرلی جائے گی لیکن اگر اس کے بعد کی منزلیں بہت دشوار گزار ہیں، تاہم مایوسی کی کوئی وجہ نہیں اور ہم کو یقین رکھنا چاہئے کہ ہم جلد یا بدیر صحیح منزل مقصود تک ضرور پہونچیں گے۔

اکبر الہ آبادی پاکستان اور ہندوستان کی نظر میں

کسی فنکار کے ساتھ جب کسی خاص طبقہ کی خوش عقیدگی بڑھ جاتی ہے تو تنقید میں غلطیاں پیدا ہونے لگتی ہیں، مثلاً آزادی کے بعد پاکستان میں جو ادبی تجدید کا نیا دور شروع ہوا تو اس میں بھی ملک و ملت کے "تنگ زاویہ کو سامنے رکھا گیا جس سے ادب کو یقیناً نقصان پہونچا۔

اکبر پرستی بھی اسی تحریک کا ایک حصہ ہے، درجنوں مضامین، رسالے اور کتابیں اکبر پر لکھی جاتی رہی ہیں اور ان سب میں ان کی اسلام دوستی اور ماضی سے وابستگی کو کھینچ تان کر یہ ثابت کر دیا جاتا ہے کہ وہ ایک عظیم شاعر تھے اور اس طرح ان کی شاعری کا صرف ایک رخ پیش کر کے تنقید کو تقریظ بنا دیا جاتا ہے۔

اکبر کا احترام ہندوستان میں بھی ہوتا ہے۔ یہاں بھی شخصی اثرات سے متاثر ہو کر اکبر کے معائب سے چشم پوشی کرنے والے موجود ہیں اور ان سے الگ ہو کر اکبر کو بطور ایک انسان اور شاعر کے دیکھنے والے بھی۔ لیکن پاکستان کے لکھنے والے تقریباً پہلے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، وہ سب مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ "اکبر فطرت کی جانب سے رسول ہو کر آئے تھے۔ ان کا پیغام اسی تحریک مغربیت کا ردِ عمل تھا اور ان کی شاعری اول سے آخر تک اسی مادیت پرستی کا جواب ہے"۔[1] وہ اکبر کو اقبال کی صف میں کھڑا کرتے ہوئے اُسے شاعر انقلاب تسلیم کرتے ہیں، اور ان کی شاعری کو پیامی مان کر اُسے کامیاب بتاتے ہیں[2]۔ مخمور اکبر آبادی اپنے مضمون "کیا اکبر رجعت پسند تھا[3]" میں لکھتے ہیں کہ "اکبر کی تلقین جو اصل میں تلقین نہیں تجدید ہے، ترقی پسندی کا جواز ہے"، گویا اکبر ان کے نزدیک ترقی پسندی کا پیش رو ہے، ایک باغی فلسفی شاعر ہے۔ کہیں وہ اسے غالب سے زیادہ حقیقت نگار بتاتے ہیں تو کہیں اس کی مذہبیت کو ہومر، ملٹن، تلسی داس، ایلیٹ کی مذہبیت سے مماثلت دیتے ہیں[4] اور کبھی تو یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ "ہند و پاکستان کی آزادی کی تاریخ میں شعر و ادب کا جب ذکر آئے گا تو اکبر الہ آبادی کا نام سرفہرست[5] ہوگا"

ہندوستان کے لکھنے والوں نے اکبر کی شاعری کو زندگی کے جان بخش زاویۂ نظر سے جانچا تولا ہے، ان کے یہاں نہ تو اکبر کے معائب سے چشم پوشی ملتی ہے نہ اُس کے محاسن کے بیان میں غلط بیانیاں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے مضمون "اکبر پر ایک نظر" میں لکھتے ہیں:۔ "اکبر مشاق غزلگو اور روایتی قسم کے صوفی تھے۔ الفاظ کے الٹ پھیر سے ہنساتے تھے۔ جاگیرداری نظام کے لائے ہوئے مغربی خیالات اور طور طریقوں سے بدگمان، سر سید کے مخالف، ترقی پسند رجحانات سے خائف اور عورتوں کی تعلیم و آزادی کے دشمن تھے"

---

[1] دیکھئے صفحہ ۹ - "اکبر اس دور میں"

[2] دیکھئے صفحہ ۱۶، ۲۶، ۲۸ "اکبر کے نکتہ چیں" از پروفیسر محمد طاہر فاروقی (اکبر اس دور میں)

[3] دیکھئے صفحہ ۷۱ - ("اکبر اس دور میں")

[4] دیکھئے صفحہ ۲۶۹ - (" ") اکبر اور تنقید حیات از سلطان برنی

[5] دیکھئے صفحہ ۱۰۲ - (" ") جزولیت از پیغمبری از ماہر القادری

[6] دیکھئے صفحہ ۷ - علی گڑھ میگزین اکبر نمبر - ۱۹۵۰

اس مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کیا واقعی اکبر ایک عظیم شاعر تھے اور ان کا کلام ادب اُردو میں اُس مقام کا حقدار ہے جو پاکستان والے اُسے دینا چاہتے ہیں۔

کسی شاعر کو عظیم بننے کے لئے لازم ہے کہ اُس کا مشاہدہ وسیع و عمیق ہوتا کہ وہ ادب میں اپنے ماحول کی سچی ترجمانی کر سکے، اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حقیقت نگاری کو موثر بنانے کے لئے وہ جذبۂ خلوص بھی رکھتا ہو، حقایقِ حیات کا جاں بخش تجزیہ بھی کر سکے، اعلیٰ فکر و تخیل کا مالک ہو اور اس کا اندازِ بیان بھی دلنشیں صاف اور سادہ ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اکبر ان شرائط پر کس حد تک پورے اُترتے ہیں۔

ہندوستان و پاکستان کے نقاد اس حد تک تو متفق نظر آتے ہیں کہ اکبر مشاہدہ کی قوت رکھتے تھے۔ شاعرانہ انداز میں انھوں نے اپنے زمانہ کی معاشرت کی نہایت دیانتداری سے ترجمانی کی ہے۔ ان کے کلام میں مسلمانانِ ہند کی اخلاقی قدروں، حکومت کی چیرہ دستیوں، قومی پریشانیوں، تہذیبی انحطاط اور قدیم و جدید کی کشمکش کی واضح تصویریں ملتی ہیں۔ اور اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ اکبر کی شاعری میں اس زمانہ کی روح پوری طرح کھنچ آئی تھی اور اس کے نقش و نگار اتنے روشن ہیں کہ اکبر کی شاعری کی تاریخی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اس کی داد دیتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے مضمون "اکبر پر ایک نظر" میں لکھتے ہیں[1] :-

"اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی ہماری پوری داستان حوصلہ و ہوس کی، الفت و آویزش کی، شور و سکوت کی، سود و زیاں کی اکبر کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔ کہیں خفی، کہیں جلی، کہیں شگفتہ کہیں حزیں لیکن ہر جگہ دلنشیں۔ اس عہد کے شعار و شعور کو سمجھنے کے لئے اکبر کے کلام سے ہر طرح کی مدد لی جا سکتی ہے۔ شاید اتنی قیمتی مدد کہیں اور سے حاصل بھی نہیں ہو سکتی۔"

اسی کے ساتھ اکبر کا خلوص بھی مسلّم ہے۔ ان کے یہاں سچے جذبات کی کمی نہیں۔ وہ ایک درد مند دل رکھتے تھے۔ جو قوم کی زبوں حالی کے دکھ سے معمور تھا۔ وہ ظریف ضرور تھے لیکن مجموعی طور پر ان کا کلام ملت کے غم میں ڈوبی ہوئی ایک آہ ہے ؎

عقاید پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے — نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر — بہت نزدیک ہے وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

وہ عوام کی ماضی سے بے تعلقی اور اسلامی تہذیب کی گرتی ہوئی دیوار کو دیکھ کر بے اختیار ہو جاتے تھے۔ انھوں نے جو کچھ بھی کہا، دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہا۔

اکبر کے خلوص کی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کے سامنے کسی انفرادی آسودگی نہیں بلکہ اجتماعی آسودگی کا سوال تھا اور یہی وہ احساس ہے جو بقول اقبال "سِل کو دل بناتا ہے" لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا اکبر اس دل کو آنکھ بھی دے سکے یا نہیں اور ایسا نہ کرنے سے ان کی عظمت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہونچ کر پاکستان کے ادیب حقایق سے چشم پوشی کر جاتے ہیں۔ یہ بتانے کے لئے کہ اکبر کی شاعری دل کو رونے رُلانے کے علاوہ اُسے حیاتِ نو کا مژدہ کیوں نہیں سناتی اُسے تیرہ و تار خانقاہوں کی طرف کیوں لے جاتی ہے؟ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اکبر کی شاعری نے کشمکش کے اس نازک دور میں آنکھ کھولی تھی جبکہ قوم یاس و انحطاط کے انتہائی نقطہ پر پہونچ چکی تھی اور عوام کے رہے سہے جذبۂ آزادی و قوتِ عمل کو غدر کی ناکامی شل کر چکی تھی۔ سیاسیات معاشیات اور تہذیب میں بتدریج انقلاب آ رہا تھا۔ حال سیہ پوش تھا، مستقبل کی خبر نہ تھی۔

---

[1] دیکھئے ص ۱۱ - علی گڑھ میگزین اکبر نمبر ۱۹۵۵ء

تعلیمی پستی کی وجہ سے فکری صلاحیتیں ناپید تھیں، ایسی حالت میں مذہب اور ماضی کا تصور قوم کے لئے بہت کچھ تسکین کا باعث تھا پھر خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی کہ اکبر نے اس کا بہت زیادہ اثر قبول کیا۔ اور خانقاہیت و روایت پرستی کو انھوں نے ایسا جزیرہ سمجھ لیا جہاں انھیں زمانے کے تھپیڑوں سے نجات مل سکتی تھی۔ نئی روشنی میں اکبر کو اپنے ماضی، اپنے مذہب اور اپنے اخلاق سب کا خون نظر آتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ مشرقیت کی برتری کی جتنی بحث انھوں نے کی ہے وہ مغرب کے داخلی پہلو کو نظر انداز کرکے کی ہے۔ ہمیشہ وہ مغرب کی خارجیت سے مشرقیت کا موازنہ کرتے رہے اور مغرب کا کوئی واضح تصور قایم نہ کرسکے۔ انھوں نے صرف بے پردگی، پتلون، کوٹ، ٹائی اور چھری کانٹے کو مغربی کلچر سمجھا، اس لئے ان کے ہاں مفکرانہ سنجیدگی کی وہ شان پیدا نہیں ہوسکی جو ایک اعلیٰ شاعر کے لئے درکار ہے۔ پرانی قدریں اقبال کو بھی عزیز تھیں۔ لیکن مغرب کے محاسن سے انھوں نے کبھی چشم پوشی نہیں کی۔ ٹیگور کو بھی اسی کشمکش کا سامنا تھا لیکن شانتی نکیتن میں ویدانت اور مغربیت دونوں کی روح جھلکتی ہے۔ راجہ رام موہن رائے بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جس سمجھ بوجھ سے یہ سب مشرقیت و مغربیت کو ملاتے ہیں وہ اکبر کے ہاں مفقود ہے۔ یہ سچ ہے کہ اکبر نے[۱] اس دھوپ میں بال سفید کئے تھے جس نے سلطنتِ اسلامی کا باغ خشک کردیا تھا" لیکن یہ چمکتی دھوپ ان کے قریب لہرے کی ایک دبیز چادر بن گئی تھی۔ جس کے پار ان کی نظر جا ہی نہ سکی۔

اکبر کو ہر اس چیز سے شدید نفرت رہی جو نئی روشنی اپنے ساتھ لائی تھی۔ ریل، تار، بجلی، چھاپ، ٹائپ، پائپ، مشین، لباس، ٹب، صابن، انجن، انگریزی تعلیم، ٹم ٹم، بائیسکل سب نئی چیزوں سے ان کی مشرقیت کو خطرہ تھا۔

وہ جانتے تھے کہ زمانہ بدل رہا ہے اور اسے نئی قدریں عزیز ہیں۔ لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور رہے۔ گو زندگی کی تلخ حقایق کی نقاب کشائی انھوں نے کی لیکن کہیں گرمی محفل کے لئے اور کہیں صرف تماشائی کی حیثیت سے۔ مولوی سید ممتاز علی کو ایک خط میں لکھتے ہیں[۲] :-

"شعرا قافیہ پیمائی ہی کیا کرتے ہیں۔ دُنیا کے قوانین شعر سے نہیں چلتے۔ زمانے کا رنگ، زمانے کی ضرورتیں فیصلہ کرتی ہیں اور اس وقت بھی کر رہی ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ شعر انقلاب کو روکنے کے لئے نہیں بلکہ یادگار انقلاب ہیں"۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں زندگی کی وہ خلش نہیں ملتی جو نہاں خانۂ دل کو گرما دیتی ہے۔ حیات نو کی وہ تعبیر نہیں جو ادب میں ابدیت حاصل کرلیتی ہے ؎

برسوں فلاسفی کی چناں اور چنیں رہی   لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں   فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
ہم کو ان تلخ مباحث سے سروکار نہیں   ہم تو اک شوخ تبسم لب کو لئے پھرتے ہیں

اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے کہ ؎

اکبر کی جو مانو، بیٹھ رہو،   جو کچھ بھی ہو لیکن صبر کرو

یا ؎

مرنے سے مفر نہیں ہے اے اکبر   بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو

اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ اکبر فرار کے قایل تھے۔ وہ رجعت پسند تھے یا تنگ نظر تھے۔ سید احتشام حسین اپنے مضمون "اکبر کا ذہن" میں لکھتے ہیں[۳] :-

---

۱؎ دیکھئے پیش لفظ از خواجہ حسن نظامی (اکبری اقبال)۔ ۲؎ ص ۱۶، اکبر کے نکتہ چیں (اکبر اس دور میں)۔ ۳؎ علی گڑھ میگزین - اکبر نمبر ۱۹۵۵ء

"کسی مادی فلسفہ کا سہارا نہ ہونے کی وجہ سے اکبر کوئی اثباتی تجویز پیش نہ کرسکتے تھے - وہ مسلمانوں کے زوال کی جستجو مادی حقایق میں نہیں اخلاقی کمزوریوں میں کرتے تھے - اس لئے وہ گھوم پھر کر پھر داخلی تصورات کی مدد سے خارجی حقایق کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے تھے - ادراکِ حقیقت کا یہ طریقہ رجعت پسندی کی طرف لے جاتا ہے اور انسان کی اجتماعی اور عملی جدوجہد سے فلسفہ اور سائنس کے جو قابلِ عمل طریقے وجود میں آئے ہیں ان سے نظریں چراتا ہے"

لیکن پاکستان کے ادیب اکبر کی اس فکری کمزوری اور تنگ نظری کو ظرافت کے پردہ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں سلیم احمد اپنے مضمون "اکبر کی تنگ نظری" میں لکھتے ہیں[۱]:-

"اکبر طنز نگار شاعر تھے اور طنز نگاری کے لئے تنگ نظری غالباً اتنی ہی ضروری ہے جتنی تنقید کے لئے خشک دماغی یا اخبار نویسی کے لئے ابتذال - طنز نگار زندگی کو 'انسان' جوں کا توں قبول نہیں کرتا"

لیکن اکبر کے طنز میں جو جھلاہٹ اور تلخی ہے وہ اُن کی تصور پرستی کی غماز ہے جس نے ان کی نگاہ کو سطحی اور ان کی فکر کے دائرہ کو محدود کر دیا تھا - ان کی شاعری کے مواد کا تجزیہ کرنے سے یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے - اکبر کی شاعری کی تمام تر بنیاد مغربیت و سرسید کی اندھا دھند مخالفت، مشرقی و مغربی عورت کے موازنہ اور روایتی مذہب پر قایم رہے - ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں[۲]:-

"ان کی شاعری کے مواد کے لئے روزمرہ کے مسایل اور کچھ خاص خاص اشخاص ہیں - جن کی خصوصیات وقتی طور پر فضا میں رہتی ہیں اور پھر زمانہ کی بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں - لیکن اگر ان ہی مسایل و اشخاص کو اور زیادہ اچھی لطافت کے ساتھ پیش کرتے تو غالباً فن اور اکبر دونوں ہمیشہ کی زندگی پا جاتے"

یہی وجہ ہے کہ حیات کے وسیع مسایل پر ہمیں اکبر کی شاعری میں کچھ نہیں ملتا - اور اکثر جگہ تو جان بوجھ کر انھوں نے زندگی کے حقایق سے چشم پوشی کی ہے - سرسید کی تحریک ان کی زندگی میں کامیاب ہو چکی تھی لیکن پھر بھی وہ اس کے مخالف رہے - جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کی چالوں کو دیکھتے ہوئے بھی وہ مہاتما گاندھی اور تحریک آزادی کو لغو سمجھتے رہے -

یہ پولٹیکل مرض[۳]، یہ ہنگامہ ہے بے سود
اس سے کوئی چیز اپنی جگہ سے نہ ہلے گی

گو اس وقت تک اقبال، پریم چند، سرور اور چکبست اُردو ادب میں زندگی کے تعمیری میلانات کی راہ دکھا چکے تھے لیکن پھر بھی وہ "ادھر کو نہ پھرے جدھر کی ہوا تھی" - جلیانوالا باغ اور حادثہ کانپور سے تو جیسے وہ بے خبر ہی تھے ترکِ موالات کے سلسلہ میں ایک بار سروجنی نائیڈو الہ آباد تقریر کرنے آئیں اکبر کو بھی مدعو کیا گیا - ضعیفی کے باعث آنے سے معذور تھے - یہ شعر لکھ بھیجا:-

شمع کے سانچے بنیں گے موم تو دکھلائیے　　　رول میں حاضر کروں گا ہوم تو دکھلائیے

اور ایسا کہنے پر وہ مجبور بھی تھے - یہ ان کی طبیعت کا رنگ تھا - جدوجہد، انقلاب اور انقلاب کی افادیت میں وہ شبہ

---

۱ ص ۱۳۸ - "اکبر اس دور میں" - ۲ ص ۱۴۱ - اکبر فنکار کی حیثیت سے - علی گڑھ میگزین - اکبر نمبر ۱۹۵۱ء
۳ صحیح لفظ "مَرَض" ہے - یا تو اکبر نے یہ لفظ غلط نظم کیا یا مصرع غلط نقل کیا گیا - (نیاز)

ہی سے اعتبار نہ رکھتے تھے ؎

ہرگز نہ مستقل سمجھ اس انقلاب کو — رکھ راہ راست بھونکنے دے اِن کلاب کو

مشرقی و مغربی عورت کا موازنہ کرتے وقت بھی اکبر پھر وہی بنیادی غلطی کر جاتے ہیں یعنی دونوں کا محض خارجی موازنہ کرتے ہیں اور صرف لونڈر اور ڈانس پر طعنہ زن ہو کر وہ بیگم کی برتری ثابت کرتے ہیں۔

عورتوں کی تعلیم اور بے پردگی پر انھوں نے جابجا وار کئے ہیں لیکن یہ خود انھیں پر لوٹ جاتے ہیں۔ آل احمد سرورؔ لکھتے ہیں کہ:

"اکبر جب پردے کو تمکنت، اقبال، میاں پن، غیرت و محبت کی علامت بتاتے ہیں تو اُن کی مشرقیت میں جاگیردارانہ رئیسانہ و امیرانہ تمدن کی خوبصورت دکھائی دیتی ہے جو مردوں اور عورتوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ نظام اخلاق مقرر کرتی ہے اور آبادی کے نصف حصّہ کو گھر کی چار دیواری میں سازِ دلبری کا اسیر رکھتی ہے۔"

اس نظریہ کی تائید اکبر کی شخصی زندگی سے بھی ہو سکتی ہے۔ ان کا اپنی پہلی بیوی خدیجہ بی بی کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لینا ان کی بے رحمی، خود غرضی اور حاکمانہ تعصب کا کھلا ثبوت ہے۔ سید بشیر حسین کہتے ہیں ؎:

"خدیجہ بیگم ایک سادہ لوح، قبول صورت اور نہایت نیک طینت عورت تھیں۔ اکبر کی دوسری شادی کے بعد وہ اپنے دونوں لڑکوں سمیت "چک" میں شدائد زمانہ جھیلتی رہیں، تازیست انھیں اکبر منزل میں قدم رکھنے کی اجازت نہ ملی۔"

اکبر کی شاعری کا تیسرا اہم جزو مذہب ہے۔ ان کی نگاہ کی سطحیت اور ان کے تخیل کی کم مایگی یہاں بھی بہت نمایاں ہے۔ گو وہ تصوف سے واقف تھے لیکن باطنیت کا سراغ ان کے ہاں بہت کم ملتا ہے۔ ان کا مذہب ظاہری رسوم اور خارجی پابندیوں کا مرکب ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے ایک دفعہ اکبر سے جبکہ وہ دہلی میں اُن کے مہمان تھے، غالب کے مزار پر چلنے کو کہا۔ پوچھنے لگے کون غالب؟ خواجہ نے جواب دیا۔ وہ تو بہت مشہور شاعر تھے۔ خفگی کے لہجے میں بولے، کیا وہی غالب جنھوں نے یہ شعر کہا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پس جو شاعر جنّت کی حقیقت کا منکر ہوا۔ اُس کی قبر پر میں کیوں جاؤں؟

مغربیت سے ان کی اندھا دھند مخالفت بھی ان کی اسی مذہبیت کا نتیجہ تھی۔ انھیں یقین تھا کہ مادیت اور سائنس کی روشنی میں مذہب اپنے پُرانے روپ میں نہیں پنپ سکے گا لیکن چونکہ مذہب ان کے نزدیک قوم کی برائیوں کا واحد حل تھا اس لئے اس کے تحفظ میں انھوں نے آنے والی روشنی سے پیٹھ پھیر لی۔

اکبر مذہب کی صحت مند اقدار سے بے خبر تھے، اور اپنی اس کورانہ تنگ نظر مذہبیت کی وجہ سے انھوں نے خود کو مادی فلسفوں سے ہمیشہ دور رکھا۔ وہ کوئی اثباتی تجویز پیش نہ کر سکے۔ اور ان کا جوش دفن ذاتی سکون کی حدود سے آگے نہ بڑھا۔

پاکستان کے ادیب کہتے ہیں کہ اگر اکبر زندگی کے مسائل کا فلسفیانہ نقطۂ نظر سے مطالعہ نہ کر سکے، تو اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ملازمت کے فرائض سے انھیں فرصت نہ مل سکی۔ اس سلسلہ میں رشید احمد صدیقی کے چند جملے ملاحظہ ہوں ؎:

"بڑا شاعر کسی نظام کا زائیدہ اور پروردہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ خود ایک نئے نظام کا مبلغ اور مبشر ہوتا ہے....."

؎۱ دیکھئے ص ۱۰۳ - علی گڑھ میگزین اکبر نمبر - (اکبر کی ظرافت اور اُس کی اہمیت)

؎۲ دیکھئے ص ۶۴ - " " " (اکبر کی لائف اور ان کا آرٹ)

؎۳ دیکھئے ص ۱۸ - " " " (معنوی استاد اکبر الٰہ آبادی)

؎۴ دیکھئے ص ۳ - "اکبر میری نظر میں" - (علی گڑھ میگزین اکبر نمبر)

اچھا اور بڑا شاعر کسی مخصوص طبقہ یا مخصوص عہد کا شاعر نہیں ہوتا، وہ ہر طبقہ اور ہر عہد کا شاعر ہوتا ہے۔ ایسے شاعر کے ہاں آن ابد ہے اور ابد آن۔ وہ ماورائے وقت ہوتا ہے۔ شبیری ہی نہیں ...... شاعری بھی حقیقتِ ابدی ہے۔"

آگے چل کر کہتے ہیں :-

"حکومت شاعر کا آلۂ کار ہوتی ہے، شاعر حکومت کا آلۂ کار نہیں ہوتا۔"

اور بڑا شاعر تو زندگی کی بندشوں کے آگے کبھی سر بسجود نہیں ہوتا۔ اُس کے آگے تو ہمیشہ اپنی ایک منزل ہوتی ہے، ایک تعمیر ہوتی ہے، حیات افروز، مضبوط اور بھرپور! برخلاف اس کے اکبر دمِ واپسیں تک انگریزی راج کی جے پکارتے رہے۔ ان کی شاعری زندگی کی ترجمان تو ضرور ہے لیکن وہ صرف زندگی کی سطح چھو کر رہ جاتی ہے۔ ان کے دل میں خلش اور کسک تو تھی لیکن ذہن کے دروازے ماضی کی کورانہ تقلید میں بند ہوگئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دماغ کا ایک حصہ دوسرے سے ہمیشہ باغی رہا اور وہ دونوں میں کوئی ربط پیدا نہ کرسکے لیکن

"وقتوں[لہ] اور ضرورتوں کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اکبر نہایت دور اندیش فنکار تھا۔ جس نے اپنی صلاحیت کا صحیح اندازہ کرکے زمانہ کی دلچسپی اور ضرورت کو ظریفانہ انداز میں پیش کرکے خراج تحسین وصول کرلیا۔"

اکبر کی مقبولیت کا راز ان کا طرزِ بیان ہے، یہ مسلّم ہے کہ اُردو شاعری میں اکبر پہلے شاعر ہیں، جنھوں نے آرائشِ خیال صرف ظرافت کی مد سے کی۔ اور بحیثیت ایک مزاح نگار کے اُردو میں وہ ایک مستقل مقام رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں بھی اکبر سائنس، تسخیرِ فطرت، فلسفہ اور ارتقائے انسانی کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں، طنز کی افادی حیثیت ختم ہوجاتی ہے اور اس کے ساتھ جب انکی ذہنی ناآسودگی اور رسم پرستی بھی شامل ہوجاتی ہے تو ان کا مزاح مزاح نہیں رہتا، مرثیہ بن جاتا ہے۔

اکبر کا یہ تضاد بھی کم دلچسپ نہیں کہ دنیا بھر کے مزاحیہ ادب میں ہمیشہ ماضی پر طنز ملتی ہے، لیکن اکبر ماضی کے دلدادہ و فریفتہ تھے اور وہ بھی صرف زندگی کے معاملہ میں، زبان و ادب کے معاملہ میں نہیں وہ کہتے ہیں :-

غنیمت ہے شبِ فرقت کی فرصت ۔۔۔ رسالہ لکھو تحقیقِ کمر میں

کیا پوچھتے ہو اکبر آشفتہ سر کا حال، ۔۔۔ خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

مغرب نے خوردبیں سے کمر ان کی دیکھ لی ۔۔۔ مشرق کی شاعری کا مزا کر کرا ہوا

اکبر کی قادر الکلامی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اس کے نکتہ چیں بھی اُس کی داد دیتے ہیں، الفاظ تو انکے ہاتھ میں جیسے کھلونا تھے۔ مس، بیگم، سید، صنم، دم، ہر چندداس، برہمن، جمن، کلیسا، اونٹ، گائے اور الفاظ ہیں جن سے اکبر نہایت دلچسپ مفہوم مراد لیتے ہیں۔ لیکن جہاں جہاں انھوں نے انگریزی الفاظ کا ناجایز استعمال کیا ہے، زبان کو بجائے فایدے کے نقصان پہونچا ہے۔ اسکے علاوہ زود گوئی اور بسیار نویسی کی عادت سے بھی ان کے بعض اشعار کو بہت عامیانہ اور سوقیانہ بنادیا ہے مگر پاکستان کے نقاد اکبر کی اس کمزوری کو نظر انداز کرجاتے ہیں۔ ذیل کے اشعار میں اکبر کی لغزشیں عیاں ہیں ؎

سینے پہ بتوں کے دسترس مشکل ہے، ۔۔۔ پوائنٹ یہ سخت ہے اسے ٹچ نہ کرو،

تحفۂ شب برات کیا تمھیں دوں، ۔۔۔ جانِ من تم تو خود پٹاخہ ہو،

ممکن نہیں اے مس ترا نوٹس نہ لیا جائے ۔۔۔ گال ایسے پریزاد ہوں اور کس نہ لیا جائے

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں ۔۔۔ مگر اندھیرے اُجالے میں چوکتا بھی نہیں

اکبر کی کلیات میں ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ اکبر کی شاعری کا پاکستان اور ہندوستان دونوں کے زاویۂ نگاہ سے تجزیہ کر چکنے کے بعد یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ اکبر اچھے مزاح نگار تو تھے، عظیم شاعر نہ تھے۔ اُن کے کلام کی تمام تر حیثیت ضمنی ہے۔ زندگی بھر وہ زمانہ کے رخ سے منہ پھیرے بیٹھے رہے اور انھیں بہت دیر میں یہ پتہ چلا کہ "ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا تھا۔" اگر یہ شعور ان میں پہلے ہی پیدا ہوجاتا تو آج انھیں اقبال و حالی کی صف میں جگہ دیجاتی۔

لہ ڈاکٹر اعجاز حسین - اکبر فنکار کی حیثیت سے ص ۱۲ (اکبر نمبر)

علوم و معارف

(آغاز اسلام سے عہدِ بنو امیہ تک)

ظہور اسلام سے پہلے عربوں کے ادب کی حالت

زمانۂ جاہلیت میں عرب اپنے ملک کی طبعی خصوصیات کی وجہ سے بادہ نشین و بادیہ پیما قوم تھی۔ نہ تو ان کے پاس عمرانیت کے وسایل تھے اور نہ دوسرے ایسے اسباب جو ان کو علمی تبحر، دینی تبصر یا زراعت کے عمدہ طریقوں کی طرف متوجہ کر سکتے۔ عربوں کے قبایل کی باہمی جنگ وجدل اور ان کے انتقامی جذبات کا سو سو برس تک نسلاً بعد نسلٍ مشتعل رہنا مشہور تھا۔ چنانچہ زمانۂ جاہلیت کی شاعری عموماً اس انتقامی تحریک اور فخر و مباہات کے تذکروں سے معمور ہے۔ ابن خلدون کے بیان کے مطابق قبیلۂ قریش میں جو تجارتی تفوق، حرم کی تولیت اور مجاورت کی وجہ سے مقتدر اور محترم خیال کئے جاتے تھے، کل سترہ آدمی ایسے تھے جنھوں نے اہل حیرہ سے لکھنا سیکھا تھا اور مدینہ میں اوس و خزرج کے قبیلوں میں صرف گیارہ آدمی ایسے تھے جنھوں نے یہودی قبیلوں سے جو ان کے پڑوسی تھے لکھنا سیکھا تھا۔ اس زمانہ میں لفظ کامل کا اطلاق ایسے لوگوں پر ہوتا تھا جو تیر چلانا، تیرنا اور لکھنا جانتے تھے۔

اسلام کا عربوں کی حالت پر اثر

اسلام نے عربوں کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا اور بہت تھوڑے عرصہ میں ان کی زندگی دوسری قوموں کے لئے باعثِ رشک ہوگئی۔ رسول اللہ نے عربوں کی شجاعت، ایثار اور اخوت کے پوشیدہ جوہر اس طرح اُبھارے کہ یہی وحشی اور جاہل عرب قوم پستی اور ادبار سے نکل کر محیر العقول اقبال و عروج کو پہونچ گئی، اکاسرہ و قیاصرہ کے ممالک کو روند ڈالا اور ان کی فتوحات کا سیلاب براعظم Pyrenees کے پہاڑوں سے ہند و چین تک پہونچ گیا اور ان مفتوحہ متمدن اقوام کے ہمسائیگی اور باہمی ازدواجی تعلقات کی وجہ سے بھی ان کی ادبی اور عقلی زندگی میں بڑا خوشگوار انقلاب پیدا ہوا۔

عربوں کی زبان پر قریش کا لغوی و لسانی اثر

عرب کی زبان پر قریش کی زبان کا اثر تو اسلام سے پہلے بھی پایا جاتا تھا لیکن جب اسلام کی فتوحات کے سلسلہ میں خلفاء، امراء اور اصحابِ حل و عقد سب خاندان قریش ہی کے ہوئے تو یہ دائرہ اور زیادہ وسیع ہوگیا۔ اور ان کی زبان جملہ قبایل کے لئے ٹکسالی زبان قرار پائی۔

ظہور اسلام کے بعد تحریک علمی کا آغاز اور اسکے وجوہات

جب نشرِ دین کے لئے کاتبین اور قارئین کی ضرورت پیش آئی تو لوگوں کی توجہ لکھنے پڑھنے کی طرف زیادہ ہوئی اور اسی لئے جنگ بدر میں جو قیدی لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور ناداری کی وجہ سے فدیہ دیکر رہائی حاصل نہیں کر سکتے تھے ان کے لئے آپ نے یہ شرط عاید کی کہ وہ دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا کر رہائی حاصل کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ نے لوگوں کو صرف عربی زبان ہی کی تعلیم کی ترغیب نہیں دی بلکہ دوسری قوموں کی زبان سیکھنے کی بھی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ آپ کی مداس کے مطابق

زید بن ثابت نے یہودیوں کی زبان سیکھی۔ رسول اللہ خود بھی دوسری قوموں کے حالات معلوم کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے خدا کے وجود اور اس کی قدرت کے ثبوت میں عموماً انھیں باتوں کو پیش کیا جو پہلی آسمانی کتابوں میں موجود تھیں۔ آپ لوگوں کو گزشتہ امتوں کے حالات سے عبرت دلاکر اپنی شریعت کی تلقین فرماتے تھے۔

تحصیل علم کی ہدایت کو آپ نے مردوں ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ عورتوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ کے ذیل کے واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کے علم کی کیا حالت تھی۔

"ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے وعظ فرمایا کہ عورتوں کا مہر ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہ رکھیں۔ اس پر ایک عورت نے آپ سے کھڑے ہوکر دریافت کیا کہ خداوند تعالیٰ کے اس قول کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے:۔

"وَاِنْ آتَیْتُمْ اِحْدٰھُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْہُ شَیْئًا" یعنی اگر تم کسی کو زر کثیر بھی دیدو تو اس سے واپس مت لو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زر کثیر بھی مہر میں دیا جاسکتا ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ تم صحیح کہتی ہو میں غلطی پر تھا۔

صحابہ کا علوم سے شغف اور ان کی مہارت

اقتصادی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے بعض صحابہ نے خاص خاص علوم میں خاص مہارت حاصل کی۔ مثلاً حضرت علیؓ نے فن قضا میں، معاذ بن جبل نے حلال و حرام کے علم میں، زید بن ثابت نے مواریث کی تقسیم اور غنیمت کے انضباط میں، ابن ابی کعب نے قرأت قرآن میں مہارت حاصل کی۔ یہی علما بعد کو شہروں میں منتشر ہوگئے اور وہاں بہت سے عرب اور موالی ان کے شاگرد ہوئے۔ چونکہ اس زمانہ کا ماحول علوم دینیہ تک محدود تھا اس لئے بنو امیہ کے عہد میں زیادہ تر دینی علوم کو فروغ ہوا۔ لیکن عباسیوں کے عہد میں علوم عقلیہ کو بھی بہت فروغ ہوا (مثلاً طب، فلسفہ، ریاضیات وغیرہ)

کلام مجید کا علمی تحریک پر اثر

چونکہ کلام مجید اور اس کے غوامض کا معلوم کرنا دینی حیثیت رکھتا تھا، اس لئے اس پر عبور حاصل کرنے کے لئے بہت غور و خوض سے کام لیا اور اس سلسلہ میں متعدد علوم و فنون کی بنیاد پڑی مثلاً:۔

۱۔ لغت، صرف، نحو، بدیع۔

۲۔ اجتماعی و اقتصادی مسایل کے سلسلہ میں احکام فقہی کا استنباط۔

۳۔ علم تاریخ کیونکہ کلام مجید میں قوموں کے حالات اور ان کے پیغمبروں کے واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

۴۔ علوم عقلیہ، کیونکہ علاوہ کلام مجید میں ایسی متعدد آیات ہیں جو کائنات پر غور کرنے کی ہدایت کرتی ہیں۔

بہر حال جب ہم ابتدائے اسلام سے عہد بنو امیہ تک ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو تین قسم کی خاص علمی تحریکوں کا پتہ چلتا ہے، سب سے زیادہ دینی تحریک (یعنی تفسیر، قرآن، حدیث، فقہ) اس کے بعد تاریخ وقصص و سیر وغیرہ اور پھر طب۔ کیمیا وغیرہ۔

تدوین کلام مجید

قرآن شریف رسول اللہ پر تھوڑا تھوڑا کرکے تقریباً ۲۲ برس کے عرصہ میں نازل ہوا۔ آپ اس کو درخت کی چھال، ہڈی اور ٹھیکری وغیرہ پر لکھوا دیتے تھے، مسلمان اس کو یاد کرلیتے تھے۔ کاتبین وحی میں زید ابن ثابت سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ اور آپ کو معلوم تھا کہ کیا لکھا گیا ہے اور کیا باقی ہے۔ چنانچہ آپ نے پورے کلام مجید کو رسول مقبول کو سنا بھی دیا تھا۔ اسی وجہ سے بعد میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے کلام مجید کو یکجا کرنے میں ان پر اعتماد کیا۔ رسول مقبول کی وفات کے بعد کلام مجید مختلف اجزاء اور حفاظ کے سینوں میں محفوظ تھا۔ جب واقعہ یمامہ میں سات سو حفاظ شہید ہوئے تو حضرت عمرؓ کو کلام مجید کے ضایع ہونے کا اندیشہ ہوا۔ آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو اس کی اطلاع دی اور مشورہ دیا کہ کلام مجید کو کتابی شکل میں مدون

ہونا چاہئیے۔ آپ کے اصرار پیہم سے بہت ہی ردو قدح کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے تدوین کلام مجید کی اجازت دی۔ چنانچہ زید ابن ثابت کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا جنھوں نے مختلف اجزا اور حفاظ کے سینوں سے کلام مجید کو کتاب کی شکل میں مدون کیا۔ یہ صحیفہ حضرت ابوبکرؓ کی حیات تک ان کے پاس رہا اور ان کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس رہا۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد حفصہ بنت عمرؓ کے پاس تھا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور قراء شہروں میں منتشر ہوگئے تو کلام مجید کے املا ولب ولہجہ میں اختلاف شروع ہوا جس کی وجہ سے غیر عرب مسلمانوں میں غلطیوں کا احتمال بہت بڑھ گیا اور تحریف کا بھی خدشہ ہوا۔ بنابریں حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابت۔ عبداللہ بن زبیر۔ سعید بن العاص۔ عبدالرحمن بن حارث کو تدوین کلام مجید کا کام سپرد کیا۔ ان لوگوں نے حفصہ بنت عمر سے کلام مجید منگا کر اس کی نقل کی اور کلام مجید کی صورتوں کو اصلی[۱] ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیا اور تمام الفاظ میں قریش کی زبان کو ترجیح دی کیونکہ کلام مجید در اصل قریش کی زبان میں نازل ہوا تھا۔

فتوحات کا زبان پر اثر اور اسکی اصلاح

ابتدائے اسلام میں وہ موالی جن کی تربیت عربی ماحول میں ہوئی تھی فصیح عربی بولتے تھے۔ جو موالی باہر سے آئے تھے وہ اس ملک میں اپنی مدت اقامت کے لحاظ سے کم یا زیادہ فصیح تھے۔ دیگر غیر عرب جو حال میں اسلام لائے تھے ان کی اقامت عرب کی مدت اتنی طویل نہ تھی کہ ان کی عجمیت کو بالکل ختم کر دیتی۔ چنانچہ غیر عرب عموماً اپنی زبان کے اسلوب اور مخارج کی طرف مایل ہوتے تھے۔ مشہور ہے کہ بلالؓ حبشی زبان۔ سلمانؓ فارسی زبان اور صہیبؓ رومی لب ولہجہ کی طرف مایل تھے اور رسول اللہ زبان میں اعراب کی غلطی کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ کسی شخص نے زبان میں آپ کے سامنے غلطی کی تو آپ نے فرمایا "ارشدوا اخاکم فقد ضلّ"۔ یعنی اپنے بھائی کو سنبھالو وہ گمراہ ہوگیا ہے۔

جب اسلام مغرب و مشرق میں پھیلا اور مختلف شہر فتح ہوئے تو غیر عرب لاکھوں کی تعداد میں مسلمان ہوئے۔ ان میں باہمی ازدواج شروع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی اولاد پیدا ہوئی جن کے حصہ میں باپ کی طرف سے فصیح عربی اور ماں کی طرف سے مخلوط عربی ملی۔ ایسے لوگ متعربین کہلاتے جن کی عربی زبان مخلوط تھی اور اس میں غیر عربی الفاظ بھی شامل ہونے لگے تھے۔

خاص عرب کے دیہاتوں کی زبان فتوحات کے بعد بھی ایک حد تک بدستور جاہلیت کی حالت پر رہی۔ البتہ شہر کے باشندوں او شریف زادوں کی زبان بازار میں غیر عربوں سے خرید و فروخت اور دیگر معاملات میں اختلاط سے نہ بچ سکی۔ جب عربوں کو اس کا احساس ہوا تو انھوں نے غیر عرب عورتوں کے ساتھ شادی کرنے سے اجتناب شروع کیا اور اپنی اولاد کو بادیہ میں بھیجنے لگے تاکہ وہ صحیح عربی زبان سیکھیں۔ چنانچہ خلفائے بنی امیہ، ان کے امراء اور اشراف اس بات کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔ معاویہ بن ابی سفیان نے اپنے لڑکے یزید کو بادیہ میں تربیت دلائی تھی۔ خلفاء بنی امیہ اور ان کے امراء اور اشراف اگر ایک مرتبہ بھی گفتگو میں غلطی کرتے تھے تو ان کے لئے یہ بات ہمیشہ باعث عار ہوجاتی تھی۔ چنانچہ عبداللہ بن زیاد، ولید بن عبدالملک اور خالد قسری عرب کے غلط بولنے والوں میں شمار کئے جاتے تھے حالانکہ یہ لوگ کافی بلیغ اور خوش بیان تھے۔

اصلاح کتابت

عبدالملک ابن مروان کے زمانہ تک کتابت مکمل نہ تھی۔ حروف نقطوں سے خالی تھے جس کی وجہ سے غیر عربوں کو کلام مجید وغیرہ پڑھنے میں دقت ہوتی تھی۔ کلام مجید میں تحریف کا بھی اندیشہ تھا۔ چنانچہ عبدالملک بن مروان نے اصلاح کتابت کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اس تحریک میں حجاج بن یوسف نے (جو شروع میں خود معلم تھا) کافی حصہ لیا۔

---

[۱] مجھے اس سے اختلاف ہے کیونکہ زید بن ثابت نے قرآن کو جس طرح مرتب کیا تھا اس کے لحاظ سے موجودہ نسخۂ قرآن مختلف ہے۔ زید بن ثابت نے نزول آیات کی تاریخی حیثیت کو سامنے رکھا تھا اور موجودہ قرآن کی ترتیب صرف چھوٹی بڑی آیتوں کے لحاظ سے ہے حالانکہ قرآن کے سمجھنے کے لئے از حد ضروری ہے کہ نزول آیات کی صحیح تاریخ سامنے ہو اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ کلام مجید کو بالکل از سر نو مرتب کیا جائے۔ (نیاز)

اس نے علامات وقف اور شکل کو خاص طریقہ سے درست کرا دیا۔

زبان کی خرابیوں کی کثرت دیکھ کر لوگوں نے نحو کی تدوین کی طرف توجہ کی۔ پہلے شخص جنھوں نے نحو کی طرف توجہ کی ابو الاسود دوئلی خیال کئے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد بصرہ میں علوم نحو کی بڑی ترقی ہوئی اور بصرہ کی دیکھا دیکھی کوفہ کے لوگ بھی نحو کی طرف متوجہ ہوئے۔

تدوین حدیث چونکہ رسول اللہ خود نہایت صحیح و شستہ زبان بولتے تھے اس لئے احادیث بھی فصاحت و بلاغت اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے بڑا مرتبہ رکھتی ہیں۔

خلفائے راشدین کے زمانہ میں سوا کلام مجید کے اور کوئی چیز تحریر میں نہیں آئی۔ کیونکہ اس وقت اگر کوئی شبہ پیدا ہوتا تو لوگ فقہا اور صحابہ سے پوچھ لیتے تھے اور اقوال رسول اس وقت اس خوف سے نہیں لکھتے تھے کہ لوگ ان پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرکے کلام اللہ سے غافل ہوجائیں گے۔ اس کے علاوہ علم کتابت بھی چنداں مکمل نہ تھا لہذا تصحیف و تحریف کا بھی اندیشہ تھا۔

بعد میں جب خانہ جنگیاں شروع ہوئیں اور متعدد مذہب اور فرقے پیدا ہوئے تو بہت سے نئے مسایل سامنے آئے اور اس وقت لوگوں کو خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ لوگ سنت رسول کو چھوڑ کر اپنے رہنماؤں کے اقوال پر اعتماد کرنے لگیں۔ ان حالات کے تحت امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر محمد بن حزم کو حدیث کی تدوین کا حکم دیا۔ انھوں نے خلیفہ موصوف کے حکم کے مطابق احادیث رسول کو سب سے پہلے کتاب کی شکل میں پیش کیا جس کو خلیفہ نے دوسرے شہروں میں تعلیم کی غرض سے ارسال کیا۔ اس کتاب کا بعد میں پتہ نہیں چلا۔

تاریخ سیر و مغازی (۱)۔ علم حدیث کی ترقی کے ساتھ علم تاریخ اور سیر کی بھی ضرورت پیش آئی۔ محدثین اور راویوں کی بھی ضرورت پیش آئی۔ محدثین اور راویوں کی صحت عقل و دیانت معلوم کرنے کے لئے ان کے انساب و قبایل کا علم ضروری ہوا اور اس طرح علم تاریخ کی بنیاد پڑی لیکن باقاعدہ تدوین حدیث اب بھی شروع نہیں ہوئی کیونکہ تابعین بھی احتیاط و تقویٰ کی بنا پر عموماً تدوین احادیث کو پسند نہیں کرتے تھے۔

(۲) بعض خلفائے بنی امیہ کو گزشتہ اقوام اور سلاطین کا حال معلوم کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ امیر معاویہ مشہور قصہ گو عبید ابن شریہ سے گزشتہ لوگوں کے حالات سنا کرتے تھے۔ اس نے ایک کتاب "کتاب الملوک و اخبار الماضیین" لکھی جو مسعودی کے زمانہ ۹۵۶ء تک موجود تھی۔

دوسرا شخص فارسی النسل وہب بن منبہ تھا جو بعد میں مسلمان ہوگیا۔ اس نے ایک کتاب "التیجان فی ملوک حمیر" لکھی۔ یہ کتاب حال میں شایع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مشہور یہودی کعب بن احبار تھا جو خلفاء اولین کے زمانہ میں ایمان لایا تھا اور امیر معاویہ کا خاص مقرب تھا۔ اس نے بھی مسلمانوں اور یہودیوں کے حالات لکھے۔ لیکن اس سلسلہ میں بہت سی روایات توریت بھی اسلامی تاریخوں میں شامل ہوگئیں۔

(۳) جب مسلمانوں کو رسول اور صحابہ کے حالات اور ان کی فتوحات معلوم کرنے کا شوق ہوا تو سیر و مغازی کی تدوین شروع ہوئی۔ عروہ بن زبیر (متوفی ۹۴ھ) پہلے شخص تھے جنھوں نے سیرت نبوی تالیف کی۔ اس کے بعد ابان بن عثمان بن عفان ۱۰۵ھ نے ایک کتاب سیرت پر تالیف کی جس کو در اصل ان کے شاگرد عبدالرحمن بن المغیرہ نے جمع کیا تھا۔ ابن شہاب زہری (متوفی ۱۲۴ھ) نے ایک کتاب مغازی پر تالیف کی۔ اس کے بعد موسیٰ بن عقبہ (متوفی ۱۴۱ھ) نے ایک کتاب مغازی پر تحریر کی جس کا کچھ حصہ خوش قسمتی سے ۱۹۰۴ء میں شایع ہوچکا ہے۔ ایک اور کتاب مغازی پر ابن اسحاق (متوفی ۱۵۱ھ) نے تالیف کی جس سے اس کے شاگرد ابن ہشام (متوفی ۲۱۳ھ) مشہور مولف سیرت النبی نے بہت کچھ استفادہ کیا۔

دیوان الانشاء والرسایل جب فتوحات کا دایرہ وسیع ہوا تو بہت سے سرکاری دفاتر ظہور میں آئے جس کی وجہ سے زبان میں بہت توسیع ہوئی۔ عبدالملک کے زمانہ میں بہت سے دفتروں کی زبان جہاں اب تک عربی زبان مستعمل نہ تھی عربی کردی گئی۔ زبان کی ترقی کے لحاظ سے دیوان الانشاء اور رسایل بہت اہم ہے۔ اس ادارے کی وجہ سے ایک نئے قسم کی نثر کا ظہور ہوا جس سے عرب پہلے سے واقف نہ تھے۔ اس قسم کی نثر نثر فنی کے نام سے مشہور ہوئی۔ نثر فنی سے مراد ان خطوط کی زبان ہے جو خلیفہ کی طرف سے حکام اور عمال کو لکھے جاتے تھے۔ اس قسم کی نثر نے اس زمانہ میں بڑی ترقی کی۔ مشہور کاتب عبدالحمید جس نے اصول کتابت اور اس کے قواعد وضع کئے زعیم الکتاب یعنی کاتبوں کے سردار کے لقب سے مشہور ہوئے۔

خطابت گو فن خطابت عربوں میں پہلے بھی پایا جاتا تھا لیکن اموی عہد میں اس کو بڑی ترقی ہوئی۔ اس سلسلہ میں جمعہ کے خطبے۔ فوجوں کی شجاعت کو بڑھانے اور قومی اور وطن پرستی کے جذبات اُبھارنے کے لئے سرداران لشکر اور دیگر حکام کے خطبے بہت مشہور ہیں۔ ایسے زمانہ میں جب اشاعت و نشر کے وسایل کم تھے، جذبات کے اُبھارنے کے لئے خطبے بہترین وسایل تھے۔ حضرت علی کے خطبے اور حسن البصری کے وہ قصص و مواعظ جو وہ عمر بن عبدالعزیز کے سامنے بیان کرتے تھے بہترین خطبے خیال کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح بہادری اور قومی جذبات کو اُبھارنے کے لئے زیاد بن ابیہ اور حجاج کے خطبے عربی زبان کا بہترین خزانہ ہیں۔ مشہور خطیب خطبہ دیتے وقت صحتِ زبان کا بڑا خیال کرتے تھے۔

چنانچہ خلفائے بنی اُمیہ کے مشہور عالم و فاضل خلیفہ عبدالملک بن مروان سے کسی نے کہا کہ آپ پر بڑھاپا جلدی آگیا تو انھوں نے جواب دیا کہ منبروں پر چڑھنے اور زبان میں غلطی کے خوف نے مجھ کو بوڑھا کر دیا۔ اسی خلیفہ سے کسی نے ایک اور موقعہ پر کہا کہ آپ پر بڑھاپا جلدی آگیا تو جواب دیا کہ بڑھاپا کیوں نہ آتا جبکہ ہر جمعہ کو مجھے اپنی عقل لوگوں کے سامنے پیش کرنی پڑتی ہو۔

علوم عقلیہ اور طب اس میں شک نہیں کہ عرب میں باقاعدہ طبیب آغاز اسلام میں نہ تھے۔ چنانچہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں حقارت کے ساتھ اس زمانہ کے طب کی حالت بیان کی ہے۔ عرب میں طب کا منبع یونانی اور فارسی ہے، حالانکہ فارسی طب نے بھی یونانی طب سے خوشہ چینی کی تھی۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں باقاعدہ طبیب طایف کا باشندہ حارث بن کلدہ تھا جس نے طب ایرانیوں سے سیکھی تھی۔ اس کے بعد اس کا لڑکا نضر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خالہ زاد بھائی تھا۔ یہ دونوں عرب کے طبیب خیال کئے جاتے ہیں۔ مغربی ایشیا کے فتوحات کے زمانے میں یونانی طب اوج پر نہ تھا تاہم کچھ لوگ یونانی طریقہ سے علاج کرتے تھے۔ چنانچہ امیر معاویہ کا مسیحی حکیم ابن اُثال اور حجاج کا حکیم تیاذوق اسی طبقہ کے حکما سے تعلق رکھتے تھے۔ بصرہ کا یہودی فارسی النسل طبیب ماسرجویہ جو مروان بن حکم کے شروع زمانے میں تھا اس نے ۶۸۳ء میں اسکندریہ کے طبیب اہرون کی کتاب خیال کی جاتی ہے۔ الولید کے متعلق کہا جاتا ہے اس نے جذام کے مریضوں کے لئے علٰحدہ قیامگاہ بنواکر ان کے علاج کا انتظام کرایا۔ عمر ثانی کے متعلق بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اسکندریہ کے طبی مدرسہ کو انطاکیہ اور حرّان میں منتقل کیا۔

الکیمیاء والنجوم جہاں تک ہم کو معلوم ہوتا ہے خالد بن یزید بن معاویہ پہلا شخص تھا جس نے علوم کیمیا اور نجوم کو عربی میں منتقل کرنے کی طرف توجہ مبذول کی۔ علم کیمیا اس وقت مدرسہ اسکندریہ میں رائج تھا۔ خالد بن یزید نے اس مدرسہ کے کیمیاء کے ماہر کاہن خالد بن مریانوس سے استدعا کی کہ وہ اس کو یہ علم سکھا دے۔

اس علم سے خالد بن یزید کو اس قدر شغف ہوا کہ اس نے خالد بن مریانوس کو قبطی و یونانی زبان سے اس علم کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔

اس خلیفہ کو علم نجوم کا بھی بہت شوق تھا۔ چنانچہ علم نجوم کے آلات مہیا کرنے اور اس کو سیکھنے میں بے دریغ کثیر رقم خرچ کرتا تھا۔ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ خود بھی اس نے کسی غیر زبان کی کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا یا نہیں جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبئین میں خالد بن یزید کے متعلق لکھا ہے کہ خالد بن یزید بن معاویہ زبردست شاعر اور خطیب اور نہایت فصیح ادیب تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے نجوم اور کیمیاء کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔

زمانۂ جاہلیت کی شاعری

زمانۂ جاہلیت کی شاعری جو دیوان العرب کے نام سے موسوم ہے عربوں کے مکارم کا مجمع، مفاخر کا منبع، شرافت کا مظہر اور فصاحت کا نمونہ خیال کی جاتی ہے۔ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ اسلام نے شاعری کو اس آیت کی بنا پر "والشعراء یتبعھم الغاوٗن" فن مردود قرار دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق شاعری کی مذمت کا سبب یہ اندیشہ تھا کہ شاعری کے مقابلہ میں لوگ کلام مجید کو پس پشت ڈالدیں گے لیکن یہ رائے صحیح نہیں۔

کلام مجید کی مذکورۂ بالا آیت سے وہ شعراء مراد ہیں جو دعوتِ اسلام کی مخالفت اور لوگوں کو اسلام کے خلاف اکسانے پر آمادہ کرتے تھے۔ ـــــ کیونکہ بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ خود رسول نے ایسے شعراء کو جنھوں نے عقاید دین کی نشر اور کلمۃ اللہ کے اعلاء کے لئے شہادت کی ترغیب اور قتال کی تحریص کی ان کی بہت قدر افزائی کی اور ان شعراء کو انعام بھی دیا۔ رسول نے اس قسم کی شاعری کو جہاد فی سبیل اللہ اور امدادِ حق قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے مخضری شاعر حسان بن ثابت کا بہت مرتبہ تھا۔

آغاز اسلام میں شاعری کی حالت

شاعری کے احترام کا ثبوت خود جناب رسول مقبول کا یہ قول ہے "ان من البیان لسحراً و ان من الشعر لحکمۃ" اس میں شک نہیں کہ رسول مقبول نے ایک نیا دین پیش کرکے لوگوں کے دلوں میں ایک ہیجان پیدا کردیا تھا۔ موافقین تو ہدایت حاصل کرنے کے لئے کلام اللہ پر غور و فکر کرتے تھے اور مخالفین اسلام کے اصولوں پر "جن سے ان کو اچانک دو چار ہونا پڑا تھا" عیب جوئی اور تردید کے لئے غور کرتے تھے۔ مخالفین جب اسلام یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتے تھے تو مسلمانوں کے معتقدات و اقوال کا مقابلہ اپنے دینی اصول سے کرتے تھے تاکہ رسول مقبول کے حملوں سے اپنے معبودوں، دینی رسوم اور اجتماعی حالات کو بچاویں۔ اسی وجہ سے ان شعراء کے کلام میں مذہبی باتوں کا تذکرہ ہوتا تھا جن کی طرف زمانۂ جاہلیت کے شعراء بہت کم توجہ کرتے تھے حالانکہ بہت سی باتوں میں اس زمانہ کی شاعری زمانۂ جاہلیت کی شاعری سے بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ خاص کر اسلامی شعراء کے ایسے قصاید جو مدح رسول یا ہجو مشرکین کے متعلق ہیں وہ قریب قریب ایسے ہی ہیں جیسے زمانۂ جاہلیت میں شیخ قبیلہ کی مدح یا ہجو میں ہوتے تھے۔ اس قسم کے مسلمانوں کے شعراء حسان بن ثابت۔ عبداللہ ابن مالک۔ کعب ابن مالک اور کعب ابن زہیر وغیرہ ہیں اور مشرکین کے اس قسم کے شعراء عبداللہ بن زبعری۔ ضرار بن خطاب اور کعب بن اشرف وغیرہ ہیں۔

آغازِ اسلام میں شعراء نے اسلام کی مدافعت میں مشرکین عرب کی ہجو کہی لیکن یہ ہجو تہذیب اور اخلاق کے حدود سے تجاوز نہیں کرتی تھی۔ حسان بن ثابت نے خود مشرکین کی جو خاندان نبی سے تعلق رکھتے تھے ہجو کی۔ رسول نے خود اس ہجو کو سنا تھا۔ ہجو میں اقذاع یعنی فحشیات کو ناپسند کیا جاتا تھا۔ حضرت عمر نے مشہور فحش گو شاعر حطیئہ کو زبان کٹوانے کی دھمکی دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو شعراء ہجو کے عادی تھے انھوں نے خود اپنی ہجو شروع کردی۔ جیسے حطیئہ نے خود یہ شعر اپنی ہجو میں کہا ہے۔ شعر ؎

اری لی وجھاً شوہ اللہ خلقہ　　فقبح من وجہٍ وقبح حاملہ

(یعنی میں ایک ایسا چہرہ دیکھتا ہوں جسے اللہ نے برا بنایا ہے۔ برا ہے یہ چہرہ اور برا ہے اس کا مالک)

چونکہ اسلامی شعراء کی توجہ افکار دینی کی طرف مبذول ہوگئی تھی اس لئے شاعری کے سابقہ اسلوب مثلاً تشبیب ومغازلہ مدح باطل، طلب انعام وہجا وغیرہ کا زور بہت کم ہوگیا۔ فتنۂ ارتداد فرو ہونے کے بعد جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو اغراض شاعری میں معارک و حصار کی تعریف، آلات قتال جو لڑائی میں استعمال کئے گئے، ان کے حالات اور دیگر نئی چیزیں جو مشاہدے میں آئیں ان کا تذکرہ، اور شدائد ومصائب کے واقعات شامل ہوگئے۔ لہٰذا مغازی اور فتوح کی کتابوں میں اس قسم کے اشعار بہت پائے جاتے ہیں۔ امیر معاویہ اور حضرت علی کے واقعات میں بھی اس قسم کے شعر ملتے ہیں۔

بنوامیہ کے زمانہ میں شاعری جب عنان حکومت بنوامیہ کے ہاتھ میں آئی تو شعر کے اغراض میں حالات اور واقعات کی بنا پر بہت کچھ تغیر ہوا۔ بنوامیہ کے زمانہ میں بہت سے فرقوں کا ظہور ہوا مثلاً شیعہ وخوارج وغیرہ۔ یہ تمام فرقے سیادت حاصل کرنے کے لئے تیغ وزبان دونوں سے جنگ کرتے تھے۔ ان کے اعلاء و اعلان مقاصد کے لئے شاعری بہتر آلہ ثابت ہوئی۔ خوارج کے گروہ کا مشہور شاعر عمران بن خطان، قطری بن فجارہ۔ زبیریوں کا مشہور شاعر عبیداللہ بن قیس الرقیات اور شیعوں کا مشہور شاعر کمیت بن زیدالاسدی اسی قسم کے پروپاگنڈا کرنے والے شاعر تھے۔

خلفاء بنی امیہ نے شعراء کے خوش کرنے میں بیحد کوشش کی۔ شعراء کو بیحد انعام واکرام دیئے۔ وظائف مقرر کئے اور ان کی سفارشیں سنیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعراء میں بنی امیہ کی خوشنودی مزاج اور ان کے دروازے تک رسائی حاصل کرنے میں تسابق کا جذبہ پیدا ہوگیا اور بہت سے شعراء بجائے اپنے گروہوں کے بنوامیہ کی تعریف کرنے لگے۔ اس داد ودہش سے دراصل بنوامیہ کا مقصد یہی تھا کہ ادباء اور علماء کے طبقہ کو اپنا طرفدار بنالیں، تاکہ وہ بنوامیہ کے خلفاء حکام اور عمال کے اعمال پر نکتہ چینی سے باز رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری بہت سے گھرانوں اور خاندانوں کے لئے حصول مال کا ذریعہ ہوگئی اور شعروشاعری کا مطالعہ، نقد وروایت علماء اور ادبا کی عادت ہوگئی یہاں تک کہ خلفاء اور ان کے امراء اور خاندان قریش کے دیگر لوگوں نے بھی شاعری شروع کردی جو اب تک اس کی طرف بہت کم توجہ کرتے تھے۔

حجاز میں شاعری کی حالت جب مفتوحہ ممالک کے مال غنیمت کی وجہ سے ثروت بڑھی اور عجمی اور دیگر اقوام کی اختلاط سے تہذیب وتمدن کا معیار بدلا تو اسلام کے مختلف ممالک کی شاعری میں ایسے فنون ظاہر ہوئے جو پہلے نہ تھے اور ادب نے بھی ایسی شکلیں اختیار کیں جس سے عرب پہلے واقف نہ تھے۔

شاعری کا دوسرے ممالک میں اثر اموی زمانہ کے مشہور شاعر جریر۔ فرزدق اور اخطل گزرے ہیں۔ یہ سب پیدائش اور تربیت کے اعتبار سے عراقی تھے۔ فرزدق اور جریر کی آپس میں بہت نوک جھونک رہتی تھی۔ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو تعصب کی بنا پر ایک شاعر کو دوسرے پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ مہلب بن ابی صفرہ والی خراسان کی اس فوج میں جس کو وہ خوارج کے گروہ ازارقہ کے مقابلہ کے لئے لے گیا تھا دو گروہ تھے۔ ایک گروہ جریر کی تعریف کرتا، دوسرا گروہ فرزدق کو فضیلت دیتا تھا۔

اس معرکہ میں اخطل بھی شریک ہوا۔ یہ فرزدق کا طرفدار تھا۔ اخطل امویوں کے دربار کا مشہور مداح شاعر خیال کیا جاتا ہے۔ اور عبدالملک بن مروان کا خاص مقرب تھا اور بغیر اجازت اس کے پاس آجا سکتا تھا۔ ان حالات کے تحت بنوامیہ کے زمانہ میں سیاسی شاعری کا بہت عروج ہوا۔

(ڈاکٹر) سعید حسن (الہ آباد یونیورسٹی)

فنِ تحریر کی تاریخ

تمہید کیا آپ نے کبھی یہ غور کرنے کی زحمت اختیار کی ہے کہ جن حروف میں آپ لکھتے پڑھتے ہیں اُن کی ایجاد کس طرح ہوئی، کب ہوئی، اُن کا موجد کون تھا، اور ان میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں ؟

پھر دُنیا میں صرف ایک ہی لکھائی نہیں ہے بلکہ ہزاروں رسم الخط ہیں اس لئے یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اُن کا باہمی تعلق کیا ہے، رسم الخط در اصل ایک ہی تھا جو ایک سے دوسری میں منتقل ہوا یا مختلف قوموں نے مختلف رسم خط اپنے اپنے زمانہ میں ایجاد کئے ، اور اسی قسم کے متعدد سوال ہمارے سامنے آتے ہیں ۔

زمانۂ قدیم میں وادیِ سندھ، ایران، عراق، ایشیائے کوچک، مصر، جزایر ایجین، چین اور وسط امریکہ میں جو رسم الخط مستعمل تھے اُن میں بجائے نشانات کے تصویروں سے کام لیا جاتا تھا، جن کی تعداد ہزاروں تک پہونچتی تھی۔ ان میں اب صرف چینی رسم الخط باقی رہ گیا ہے اور سب فنا ہو گئے۔

اس لئے ہمیں ممنون ہونا چاہئے اُس شخص یا قوم کا جس نے ایسی لکھائیوں کے مقابلہ میں جن میں ہزاروں نشانات سے کام لیا جاتا تھا، ایسا رسم الخط ایجاد کیا جو صرف چند درجن حروف پر مشتمل ہے ۔

حروف کی ایجاد کے علاوہ کتابت کی درستی و اصلاح بھی فنِ تحریر کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ کاغذ کی ایجاد سے پہلے بھوج پتر، پیپرس، ریشم، چمڑے، ہڈی، لکڑی، مٹی کی تختیوں اور پتھر کی سلوں پر لکھنے کا چلن تھا۔ لیکن باوجود ان تمام دشواریوں کے پُرانے زمانہ کے لوگ لکھنے پڑھنے کی قدر کرتے تھے اور اُن میں تعلیم و تعلم کا خاصہ رواج تھا۔ چنانچہ پنتر (عراق) میں ماہرینِ اثریات نے ایک بہت پُرانے زمانہ کا مدرسہ دریافت کیا ہے اور اب سے ایک صدی اُدھر سر آگسٹس ہینری لیرڈ نے شہنشاہ اشور بنی پال (۶۶۸ لغایۃ ۶۲۶ ق ـ م) کے کتب خانہ کا اکتشاف کیا تھا جس میں مٹی کی تختیوں پر لکھی ہوئی ہزاروں کتابیں ملی ہیں اور ان کے علاوہ بہت سے مٹی کے خطوط بھی ملے ہیں جو مٹی کے لفافوں میں بند تھے ۔

یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ فنِ تحریر کا آغاز اب سے پچاس ہزار سال یا اس سے بھی کچھ پہلے ہوا تھا کیونکہ اسپین اور فرانس کے غاروں میں نقاشی کے جو نمونے ملے ہیں وہ تقریباً اسی زمانہ کے ہیں جب فنِ تحریر کی ابتدائی صورت روزانہ زندگی کی تصویر کے علاوہ کچھ نہ تھی ۔

جب آپ کسی کو گنتی کا شمار لکیروں کی صورت میں کرتے پائیں (اور یہ چیز آپ کو اکثر جاہل لوگوں میں نظر آئے گی) تو آپ سمجھ لیں کہ یہ طریقہ اُس زمانہ کی یادگار ہے جب انسان غاروں میں رہا کرتا تھا۔

جب آپ کسی مرد کو رومال میں اور عورت کو آنچل میں بات یاد رکھنے کے لئے گرہ لگاتے دیکھیں تو باور کریں کہ یہ طریقہ اُس زمانہ کی ایجاد ہے جب انسان لکھنا نہیں جانتا تھا۔

جب آپ کو سڑک کے کنارے آمد و رفت کے نشانات نظر آئیں (مثلاً ہاتھ یا تیر کا نشان سمت بتانے کے لئے) تو سمجھ لیں کہ یہ بھی فنِ تحریر کی قدیم صورت ہے اور جب آپ کسی زبان کے رسم الخط پر نظر ڈالیں تو یہ بھی یقین کیجئے کہ اُس کے ایک ایک حرف کی

موجودہ صورت صدیوں کے تغیر و تبدل کا نتیجہ ہے اور جس طرح دریا کی موجیں پتھر کے ناہموار ٹکڑوں کو سڈول بنا دیتی ہیں اُسی طرح عہد بہ عہد کی تبدیلیوں کے بعد حروف بھی اپنی موجودہ صورت تک پہونچے ہیں۔

پُرانے زمانہ کے لوگ فنِ تحریر کو دیوتاؤں کی ایجاد سمجھتے تھے۔ چنانچہ مصر کے لوگ تھاتھ دیوتا کو (جس کا جسم انسان کا اور سر پرند کا بنایا جاتا تھا) کلدانی اوینیس کو (جسے مچھلی کی کھال اوڑھے دکھایا جاتا ہے) اور ہندو برہما کو (اسی لئے ہند قدیم کا رسم الخط براہمی کے نام سے موسوم تھا) فنِ تحریر کا موجد سمجھتے تھے لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب انسان ہی کی ایجاد تھی۔ اس مقالہ میں انھیں تمام مسایل پر بحث کی جائے گی۔

فنِ تحریر تقریر کو قلمبند کرنے کا آلہ ہے اور دونوں کا تعلق سمجھنے کے لئے زبان کی ماہیت کا جاننا ضروری ہے

فنِ تحریر کیا ہے؟ زبان ایک فرضی چیز ہے یعنی اُن مفرد آوازوں کی ترکیب سے جنھیں انسان اپنے منہ سے نکال سکتا ہے ہزاروں مرکب آوازیں یا الفاظ بنتے ہیں۔ یہ آوازیں دنیا کی مختلف چیزوں کے لئے بطور نام کے استعمال کی جاتی ہیں جس کا منشاء یہ ہے کہ انسانی حافظہ ہر اس چیز کی تصویر کو چشمِ تصور کے سامنے پیش کردے جس کا نام لیا جائے مثلاً جب ہم قلم کہتے ہیں تو ہمارے دماغ میں قلم کی تصویر آتی ہے پینسل کی نہیں۔ پینسل کی تصویر جب ہی سامنے آتی ہے جب ہم پینسل کہتے ہیں گویا الفاظ انسان کے دماغ میں مختلف چیزوں کی تصویریں پیش کرنے کے آلے ہیں۔ الفاظ کے کثرتِ استعمال سے تصویریں تحت الشعور میں چلی جاتی ہیں اور انسانی دماغ کو ہر ہر لفظ پر تصویر کشی نہیں کرنا پڑتی۔

زبان کی طرح فنِ تحریر بھی ایک فرضی چیز ہے یعنی اُن مفرد آوازوں کے لئے (جن سے زبانِ انسانی کے الفاظ مرکب ہیں) کچھ نشانات مقرر کردئے گئے ہیں یعنی فلاں نشان فلاں آواز کو ظاہر کرے گا۔ ایسے نشانات کو حروف ہجا یا حروف تہجی کہتے ہیں انھیں پڑھنے کے معنی صرف یہ ہیں کہ انسان اپنے دماغ میں اُن آوازوں کو سوچے یا منہ سے نکالے جن کا مظہر ان نشانات کو قرار دیا گیا ہے۔ آپ کسی کاغذ پر لفظ گلاب لکھ کر کسی ایسے شخص کے سامنے رکھئے جو اُردو یا فارسی رسم الخط نہیں جانتا۔ وہ نہیں بتا سکے گا کہ ان نشانات کا کیا مطلب ہے لیکن جب آپ کی نظر مندرجۂ بالا نشانات پر پڑے گی تو آپ اُردو رسم الخط کے اصول سے واقف ہونے کی بنا پر فوراً معلوم کرلیں گے کہ یہ نشانات اِن آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں اور جب آپ نے اُنھیں ترتیب دیا تو لفظ گلاب بن گیا اس لفظ کا آپ کے نزدیک کوئی مفہوم نہ ہوتا اگر آپ نے گلاب کا پھول نہ دیکھا ہوتا۔ اس لئے اصل چیز تو گلاب کا پھول ہے، اس کے بعد لفظ گلاب ہے جو آپ کے دماغ میں صرف ایک خاص پھول کی تصویر سامنے لاتا ہے اور تیسری چیز وہ نشانات ہیں جو آپ کے دماغ میں لفظ گلاب کا تصور پیدا کرتے ہیں۔

فنِ تحریر کے فوائد انسان کی زبان ایک محدود فاصلے تک سُنی جاسکتی ہے اور اُس کا وجود اُتنی ہی دیر کے لئے ہے جب تک اسے بولا جاتا ہے لیکن تحریر کے ذریعہ سے ہم اسے دیرپا بنا سکتے ہیں۔ اور دُنیا کے ہر گوشے میں پہونچا سکتے ہیں اور ہر زمانہ میں انھیں پڑھا جاسکتا ہے۔

اُس کا ایک فایدہ یہ بھی ہے کہ انسانی دماغ دُنیا بھر کی باتیں نہیں یاد رکھ سکتا، لیکن اگر اُنھیں لکھ لیا جائے تو وہ باتیں محفوظ ہوجاتی ہیں اور ان تحریری معلومات سے ہر وقت فایدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ ہماری تہذیب و شائستگی کو وجود میں لانے اور باقی رکھنے میں فنِ تحریر کا بڑا ہاتھ ہے۔ دنیا کے تمام علوم و فنون تحریر ہی کی بدولت زندہ ہیں۔

فنِ تحریر کی اقسام انسان کی زبانیں دو ہیں ایک وہ جس میں الفاظ سے کام لیا جاتا ہے اور دوسری وہ جس میں چشم و ابرو اور ہاتھ پاؤں کے اشاروں سے مدد لی جاتی ہے۔ اسی طرح فنِ تحریر کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس میں حروف ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جس میں تصویروں سے کام لیا جاتا ہے۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ انسان کی دو زبانوں میں کون زبان زیادہ قدیم ہے لیکن اتنا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اشاری گفتگو کا سیکھنا نسبتاً آسان ہے اور اُس کا استعمال نہایت وسیع ۔ اگر آپ کا ایسے لوگوں سے سابقہ پڑے جو آپ کی زبان نہ جانتے ہوں اور نہ آپ اُن کی زبان جانتے ہوں تو آپ مجبور ہو جائیں گے کہ اپنا مطلب اشاروں سے سمجھائیں ۔ فرض کیجئے کہ آپ چین جائیں اور کسی سے کہیں کہ مجھے پانچ انڈے دے دو تو وہ آپ کا مطلب نہ سمجھے گا لیکن اگر آپ انڈوں کی طرف اشارہ کرکے، پانچ انگلیاں اُٹھا کر اپنی طرف اشارہ کر دیتے ہیں تو آپ کو پانچ انڈے مل جائیں گے ۔

اشاری گفتگو کیا ہے ؟ ہاتھ پاؤں کے اشاروں سے کسی چیز یا کام کی نقل کرنا ۔ مثلاً آپ کو لکھنے کا مفہوم ظاہر کرنا ہو تو آپ اپنے بائیں ہاتھ کو اس طرح پھیلائیں گے گویا اس پر کاغذ رکھا ہے اور پھر دائیں ہاتھ کو ایسا بنائیں گے گویا انگلیوں میں قلم دبا ہے اور پھر اُسے بائیں ہاتھ پر اس طرح پھرائیں گے، گویا قلم گردش میں ہے ۔

اسی طرح تصویری رسم الخط کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ ہمیں جن چیزوں اور جن کاموں کا بیان مقصود ہے اُنھیں تصویروں میں ظاہر کریں ۔

اشاری گفتگو کا استعمال دو صورتوں میں کیا جاتا ہے ایک تو ایسی حالت میں جب ہم بول نہ سکتے ہوں یا بولنا نہ چاہتے ہوں ۔ (اسی لئے گونگے اشاری گفتگو سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں، ہندوستانی رقص بھی اشاری گفتگو کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے) اور دوسرے جب ہمیں اپنے بیانات کی وضاحت منظور ہوتی ہے ۔ آخری صورت مقرروں اور واعظوں میں زیادہ پائی جاتی ہے ۔

زمانۂ بعید کا انسان حروف کے استعمال سے ناآشنا تھا ۔ اور تصاویر کے ذریعہ سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا جنھیں پڑھا نہیں بلکہ دیکھ کر سمجھا جاتا تھا ۔ آگے چل کر انھیں تصویروں سے حروف کی ایجاد ہوئی ۔

فنِ تحریر کے مدارجِ ارتقاء

۱ - **تصویر کی شکلوں میں ارتقاء** ــ فنِ تحریر کا آغاز مصوری سے ہوتا ہے ۔ تصاویر کے ذریعہ سے خیالات کے اظہار کو تصویری رسم الخط کہتے ہیں ۔ شروع میں تصویروں کو پوری تفصیل کے ساتھ بناتے تھے لیکن لکھنے کی سہولت اور وقت کی بچت کے لئے تفصیلات دن بدن کم ہوتی گئیں اور پوری تصویر بنانے کے بجائے صرف اُس کے نمایاں حصّوں کا بنانا کافی سمجھا گیا ۔ یہاں تک کہ ایک منزل ایسی آئی جب تصویر کا تصویرپن غائب ہوگیا ۔ مثلاً عربی رسم الخط کو لیجئے کہ اُس کے پہلے حرف "الف" کے معنی بیل کے تھے ۔ اس کے لئے پہلے بیل کے چہرے کی تصویر اس طرح بنائی جاتی تھی (یعنی بجائے پورا بیل بنانے کے صرف اُس کا سر بنانا کافی سمجھا جاتا تھا) اس کے بعد یہ سر کی تصویر صرف ایک لکیر یعنی (ا) رہ گئی ۔

۲ - **تصویر کے معنوں میں ارتقاء** ــ تصویری رسم الخط کی ابتدائی صورت میں تصویروں کو پڑھا نہیں جاتا تھا بلکہ دیکھ کر سمجھا جاتا تھا ۔ پہلے تو جس چیز کی تصویر بنائی جاتی تھی وہی چیز مراد لی جاتی تھی ۔ (ایسی تصاویر کو "سادہ تصاویر" (PICTO GRAPHS) کہتے ہیں) بعد میں اُس تصویر سے تعلق رکھنے والی چیزیں بھی اسی تصویر سے ظاہر کی جانے لگیں ۔ ایسی تصاویر کو "تصاویرِ خیالی" (IDEO GRAPHS) کہتے ہیں ۔ مثلاً اگر سورج، چاند کی تصویریں بنا کر سورج، چاند مراد لئے جائیں تو یہ سادہ تصاویر ہوں گی لیکن اگر سورج بنا کر دن، سال، یا سونا مراد لیا جائے اور چاند بنا کر رات، مہینہ یا چاندی تو یہ تصاویرِ خیالی ہوں گی ۔

تصویری رسم الخط کی ابتدائی حالت میں سادہ تصاویر اور تصاویرِ خیالی دونوں کا استعمال ایک ساتھ کیا جاتا تھا ۔

۳ - **تصویر کی آوازوں میں ارتقاء** ــ تصویری رسم الخط کی دوسری منزل میں تصویروں کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ پڑھا

بھی جاتا تھا، جیسے سورج کی تصویر بنانا اور اُسے "سورج" پڑھنا۔ جس چیز کی تصویر ہو اُس کو اُسی نام سے پکارنا، ایسے نشان کو "تصویری لفظ" (WORD - SIGN) کہتے ہیں۔ یعنی تصویر جو پورے لفظ کا مفہوم ادا کرتی ہے۔

اس کے بعد ایک ایسی منزل آئی جب تصویر کے نام اور اُس کے معنی میں باہم کوئی تعلق نہ رہا یعنی جس چیز کی تصویر ہوتی ہے اُس سے وہ چیز مراد نہ ہوتی تھی بلکہ اُس تصویر کے نام کے ہم آواز کسی اور لفظ کا مفہوم مراد لیا جاتا تھا جیسے (انگریزی زبان میں) سورج کی تصویر بناکر بجائے SUN (سورج) کے SON (بیٹا) مراد لینا۔ اس طریقے کو REBUS SYSTEM کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت سے لفظوں کو لکھنے میں آسانی ہوگئی ہے کیونکہ ہر لفظ کی تصویر نہیں بنائی جاسکتی، مثلاً انگریزی کا ایک لفظ ہے (BELIEF) جس کے معنی "عقیدے" کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی تصویر نہیں بنائی جاسکتی اس لئے "ریبس والے طریقے" کی مدد سے اسے یوں لکھنے لگے:-

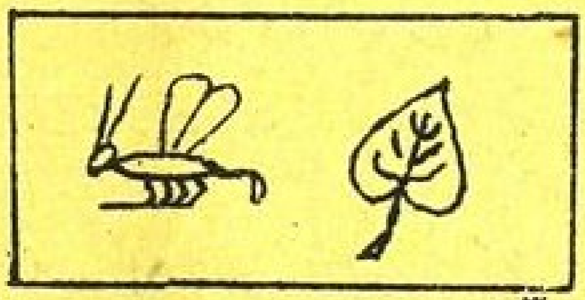

BEE (شہد کی مکھی) + LIEF (پتّی) = BELIEF

اسی طرح کے انگریزی زبان کے چند اور الفاظ اور جملے جنھیں تصاویر کی مدد سے ظاہر کرسکتے ہیں یہ ہیں:-

PEN	- MAN	SHIP		=	خوش خطی
قلم	آدمی	جہاز			
I	CAN	NOT	FLY	=	میں نہیں اُڑ سکتا
آنکھ	پیپا	گرہ	مکھی		
I	CAN	SAW	WOOD	=	میں آری سے لکڑی
آنکھ	پیپا	آری	لکڑی		کاٹ سکتا ہوں

مگر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ طریقہ اُنہی زبانوں میں مستعمل ہوسکتا ہے جن میں الفاظ کے متعدد معنی ہوں یا جس میں مختلف معنی رکھنے والے الفاظ کی آواز ایک ہو (HOMO PHONES) جس زبان میں ایسے الفاظ نہ ہوں گے یا کم ہوں گے اسمیں اس طریقہ سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ اس کے برعکس ایک دوسری صورت یہ ہے کہ کسی زبان میں ایک ہی خیال کے لئے بہت سے الفاظ موجود ہوں (POLY PHONES) اس صورت میں ایک ہی تصویر کی (جو ایک تخیل کی حامل ہوگی) متعدد آوازیں ہوں گی

کسی لفظ کو لکھنے کے لئے ہم اُسے سادہ مفرد آوازوں میں تقسیم کرتے ہیں اور ان آوازوں کو ظاہر کرنے والے نشانات کو حروف کہتے ہیں۔ یہ حروف دو قسم کے ہوتے ہیں حروفِ صحیح (CONSONANTS) اور حروفِ علت (VOWELS) علاوہ ازیں الفاظ کی تقطیع کا ایک طریقہ اور ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ اگر لفظ (NOVEL) کے ٹکڑے یوں N-O-V-E-L (اس میں دوسرے اور چوتھے حروف، حروفِ علت ہیں، بقیہ حروفِ صحیح) کرنے کی جگہ اس طرح کریں NO-VE-EL (یا NO - VEL) تو ان ٹکڑوں کو ارکانِ لفظ (SYLLABLE) کہیں گے۔

قبل اس کے کہ انسان نے حروفِ صحیح اور حروفِ علت کی علامتیں وضع کیں اُس نے ارکانِ الفاظ کے لئے نشانات وضع کئے۔ ان کے وضع کرنے میں "ریبس والے طریقے" سے مدد لی گئی یعنی بسا اوقات جب کسی لفظ کے ٹکڑے کئے گئے تو معلوم ہوا کہ

اُس کے ہر ٹکڑے کے معنی ہیں جس کی تصویر بنائی جا سکتی ہے۔ جیسے مذکورہ صدر انگریزی لفظ BELIEF میں آواز BEE کے معنی "شہد کی مکھی" اور LEAF کے معنی "پتی" کے ہیں لیکن ان تصویروں کے ظاہری مفہوم کو نظر انداز کرکے تصویروں کے مجموعی نام سے جو دوسرا لفظ بنتا ہے وہ مراد لیا گیا ــ جس رسم الخط میں ارکانِ الفاظ کے نشانات کام آتے ہیں اُسے (SYLLABARY) کہتے ہیں اور جس میں حروفِ صحیح اور حروفِ علّت آئے (ALPHABET) کہتے ہیں۔

حروف کی ایجاد میں ایک خاص طریقے سے مدد لی گئی، جسے (ACROPHONY) کہتے ہیں، یعنی بعض تصویری الفاظ چن کر اُن کے ناموں کی شروع کی آوازیں لے لیتے ہیں اور بقیہ کو حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً عربی رسم الخط کے پہلے حرف (الف) کے معنی بیل کے ہیں گویا وہ ایک لفظ ہے لیکن اِسے جب کسی دوسرے حرف سے ملاتے ہیں تو شروع کی آواز "آ" لے آتے ہیں اور بقیہ آوازیں "لَ" اور "فَ" کو حذف کر دیتے ہیں۔

یہاں تک تو صرف تمہید یا تعارف تھا، اس کے بعد ہم تفصیل کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ موجودہ فنِ تحریر کی ابتدائی و اساسی شکلیں مختلف ممالک و اقوام میں کیا تھیں، اور پھر وہ رفتہ رفتہ کن تبدیلیوں کے بعد انھوں نے موجودہ شکل اختیار کی۔

امید ہے کہ ہم اس مضمون کو بالاقساط دسمبر ۵۳ء تک پورا کر دیں گے۔

(باقی) محمد اسحاق صدیقی

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

"فرمانروایانِ اسلام" نمبر ہوگا

جو اُردو میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہوگی۔ اس میں آغاز اسلام سے لیکر زمانۂ حال تک کی ان تمام چھوٹی بڑی مسلم حکومتوں کا مختصر حال درج ہوگا، ہر حکمراں خاندان کے فرمانرواؤں کی فہرست ہوگی جس میں ان کے نصب و عزل کو ہجری اور عیسوی سالوں کی مطابقت کے ساتھ ظاہر کیا جائے گا۔

یہ گویا ایک انسائکلوپیڈیا ہوگی جس کے ذریعہ سے آپ ہزاروں فرمانروایانِ اسلام کے نام، سیکڑوں مسلم حکومتوں کے عروج و زوال کی تاریخ آسانی سے معلوم کر سکیں گے۔

کرۂ ارض کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں مسلمانوں کے قدم نہ پہونچے ہوں، لیکن بہت کم ہیں جن کو ان فاتحانہ اقدامات کا علم حاصل ہے ــ یہ سالنامہ مسلم حکومتوں کی ہزاروں سال کی تاریخ کا ایسا مکمل نقشہ ہوگا کہ اس کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی دوسری کتاب کی ورق گردانی کی ضرورت نہ ہوگی ــ یہ سالنامہ نہ صرف تاریخ کے طلبہ، اساتذہ، تصنیف و تالیف کے شائقین بلکہ عوام کے لئے بھی حد درجہ ضروری و دلچسپ چیز ہوگی۔

منیجر نگار

یادِ رفتگاں

(داغ کے چند مخصوص رامپوری تلامذہ)

احساؔن رامپوری = منشی احسان علی خاں ولد منشی اکرام الدین علی خاں ۔ ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے ، عربی فارسی میں اچھی استعداد تھی، شاعری میں داؔغ کے شاگرد تھے ، چونکہ اُستاد سے خصوصیت تھی اس لئے فراش خانہ سرکاری میں یہ بھی ملازم ہوگئے، زیادہ وقت استاد کے ساتھ گزرتا ۔ ان کو سوز خوانی اور نوحہ اور سلام کہنے کا بھی شوق تھا ، غزل ، قصاید ، مثنویات ، رباعیات وغیرہ جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ، استاد کی روش کو نباہنے کی پوری پوری کوشش کی ۔ زبان کا جو لطف ان کے کلام میں پایا جاتا ہے ، اُس کی مثال دوسرے شاگردان داؔغ میں مشکل سے ملے گی ، بہت زود گو تھے متعدد تصانیف کیں مگر ان کے انتقال کے بعد ورثاء نے جملہ کتب بازار میں فروخت کردیں اب صرف ایک دیوان قلمی باقی ہے جس میں جملہ اصناف سخن پائے جاتے ہیں رامپور میں ان کے شاگرد بہت تھے ، بعمر ۶۵ سال ۱۹۰۹ء میں انتقال ہوا ۔

منشی ممتاز علی آؔہ (مولف سوانح عمری امیر مینائی صفحہ ۲۴ و ۲۵) لکھتے ہیں کہ ۱۸۹۱ء کا زمانہ وہ تھا کہ رامپور میں منشی صاحب (امیؔر) منشی امیراللہ تسلیؔم مرحوم اور آغا میرزا شاغؔل مغفور (برادر فصیح الملک) کے سوا استادوں میں کوئی نہ تھا ، داؔغ ، جلاؔل ، شاغؔل اور تسلیؔم کے تلامذہ نے باہم مشورہ کرکے ایک ماہوار مشاعرے کی بنیاد ڈالی ۔۔۔۔ حضرت سے اجازت لی ، مشاعرے ہونے لگے جس میں تسلیؔم مرحوم اور شاغؔل مرحوم بھی غزل کہتے اور شرکت فرماکر مشاعرے کو رونق بخشتے ۔۔۔ طرح حضرت (امیؔر) نے دیوان امیؔر سے "ہلال کے" "کمال کے" نکالی ۔۔۔۔ چند روز کے بعد اثؔر اور رازؔ وغیرہ (شاگردانِ امیؔر) نے ذکر کیا کہ احساؔن تلمیذ داؔغ کہتے ہیں اچھے میں نے دو غزلیں کہی ہیں ایک لکھنؤ والوں کے رنگ میں ، دوسری دلّی والوں کے رنگ میں ۔ احساؔن مرحوم کے اس طنز کو امیر مینائی نے محسوس کیا اور آؔہ کو مجبور کرکے غزل کہلوائی ، اب احساؔن کی دہلوی اور لکھنوی رنگ والی غزلوں کے اشعار ملاحظہ کیجئے جس سے اندازہ ہوگا کہ رام پور میں جو مذاق شاعری پیدا ہوچکا تھا اُس کے تحت شاگردانِ داؔغ بھی لکھنوی اسکول کا مذاق اڑاتے تھے ۔

غزل لکھنوی رنگ میں

لائے ہیں دام زلف سے دل کو نکال کے | آئی بلا کو آئے ہیں ہم سر سے ٹال کے
وحشت میں دُھن بندھی ہے لکھوں وصفِ چشم یار | خامے بنا رہا ہوں میں شاخ غزال کے
کیوں بیچ اُٹھاؤں کا کل پیچاں کو دے کے دل | صدمے مری بلا سہے رنج و ملال کے

غزل دہلوی رنگ میں

جس ناتواں سے ناز تمہارے نہ اُٹھ سکے | کس طرح وہ اُٹھائے گا صدمے ملال کے
جھپکے گی برقِ طور سے ہرگز نہ میری آنکھ | جلوے نگاہ میں ہیں کسی کے جمال کے

ان کے کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو :-

کچھ عجب حال ہے جب سے اُسے دیکھا کیا ہے | ہم نہیں آپ میں احساؔں یہ تماشا کیا ہے
شکرِ جفا کو شکوہ سمجھ کر خفا ہوا | لو میں نے کیا کہا بتِ بدظن نے کیا سُنا
پردہ ڈھک دے اجل آکر کہیں بیچاروں کا | حال دیکھا نہیں جاتا ترے بیماروں کا
کاش اس سے تو بے زباں ہوتے | حرفِ مطلب کبھی ادا نہ ہوا ،

کیا کہیں ہجر بُرا اور وصال اچھا ہے — یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

میں تم سے کیا کہوں جو مرے دل کا حال ہے — اللہ کی قسم مجھے صدمہ کمال ہے

دلیر۔ سید امیر حسن ولد سید الطاف حسین مارہروی سال ولادت ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ھ ہے۔ استعداد علمی معقول تھی پہلے مضطر خیرآبادی کے شاگرد ہوئے پھر نواب مرزا داغ کے ——— روز مرہ میں بے تکلفی اور کلام میں روانی اور زبان میں صفائی پائی جاتی ہے، ۱۹۱۰ء کے قریب رامپور آکر ملازم ہو گئے۔ دلیر نے ہزلیات کا مجموعہ بھی چھوڑا، بقول احسن مارہروی مرحوم داغ کے بہترین شاگرد تھے۔ (انشائے داغ)

روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں — بیٹھے بٹھائے آج مجھے ہو گیا ہے کیا

ہیں سب خیال و خواب کی باتیں یہ ہمنشیں — آنکھوں میں رہ گیا نہ کوئی دل میں رہ گیا

دم نکل جائے تو ہو ہجر کی مشکل آساں — موت کام آئے اگر آج تو کچھ کام چلے

ظلمتِ شام جدائی کب ہٹائے سے ہٹے — سامنے آنکھوں کے اک دیوار ہو کر رہ گئی

افسوس دل کا حال کوئی پوچھتا نہیں — یہ کہہ رہے ہیں سب تری صورت بدل گئی

رسا۔ منشی حیات بخش، موضع کاسنہ ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے، استعداد علمی رسمی تھی، تعلیم سے فارغ ہو کر سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے، شعر و سخن سے دلچسپی ہوئی تو نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے شاگرد ہو گئے، ۱۸۸۵ء میں تحصیل مصطفےٰ آباد، مین پوری میں تعینات تھے اور ۱۸۸۹ء میں شکوہ آباد میں محرر جوڈیشل تھے، گلدستوں میں آپ کا کلام طبع ہوتا رہا۔ آخر ۱۹۰۰ء میں رسا رام پور آئے اور سرکاری مشاعرے میں جو شہر کے اہتمام سے منعقد ہوتے تھے شریک ہوئے۔ یکم دسمبر ۱۹۰۰ء کے مشاعرہ میں جو غزل پڑھی تھی اُس کا مطلع درج ہے ؎

آئے دن تکرار شب ہے آئے دن تکرار صبح — اب تو یا اقرار شب ہو ہم سے یا اقرار صبح

یکم جنوری ۱۹۰۱ء کو جو سرکاری مشاعرہ ہوا وہ ہندوستان کے مشہور مشاعروں میں ہے، کثیر تعداد میں بیرونی شعراء شریک ہوئے۔ رسا بھی شریک مشاعرہ تھے آپ نے جب طرحی غزل کا یہ شعر پڑھا ؎

تم عرض مدعا پر میری زباں نہ کھینچو — ہاتھوں میں چُبھ نہ جائیں کانٹے زبان پر ہیں

مضطر خیرآبادی نے انتہا سے زیادہ داد دی، اس کے بعد یہ مضطر کی سفارش سے سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے اسی کے ساتھ وکالت کی استدعا ہوئی۔

انتخاب کلام یہ ہے:۔

رسا مانو خدا کو یا بتوں کے دل میں گھر کر لو — یہ دو دن زندگی کے جس طرح چاہو بسر کر لو

نصیب اُن کا ہٹاتے ہیں جو زلفیں روئے روشن سے — سحر کو چپکے چپکے منھ تمہارا دیکھنے والے

اُس بت نے جو پیار سے نظر کی — کچھ بھی نہ چلی دل و جگر کی

کر لی ہیں جو اُن سے چار آنکھیں — اب اور ہوا ہے نامہ بر کی

نہ دیر میں ہمیں راحت، نہ چین کعبے میں — ٹھہرنے دے گا نہ اس دل کا اضطراب کہیں

تصور ہی سے اُن کے دو گھڑی دل کو تسلی دوں — مجھے اتنی تو فرصت دے کسی دن بیخودی میری

کیوں کر نہ ہوں ہم ہجر میں ممنونِ تمنا — سو بار ہمیں آپ کے گھر لے کے گئی ہے

سوجھی ہے جنوں میں ہمیں کعبے کے سفر کی — وحشت ہمیں اللہ کے گھر لے کے گئی ہے

میرا نہیں ہے کوئی کسی کا نہیں ہوں میں اس طرح ہوں جہان میں گویا نہیں ہوں میں
ترے وعدے کا ہے مجھ کو یقیں، لیکن یہ کھٹکا ہے کہیں دھوکا نہ دے جائے مجھے عمرِ رواں میری
ذکرِ وفا پہ آپ کو شرمِ جفا ہے کیوں اک بات تھی کہ میری زباں سے نکل گئی

شاغل - محمد آغا معروف بہ آغا مرزا خلف آغا تراب علی برادر اخیافی نواب مرزا خاں داغ - ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۱ء میں پیدا ہوئے، دہلی ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی، نہایت خوش فکر اور ذہین و طباع تھے علمی قابلیت رسمی تھی لیکن دہلی کی فضائے ادب نے اس کمی کو پورا کر دیا دہلی کے نوجوان شعرا میں یہ بھی مرتبۂ امتیاز رکھتے تھے۔ ہنگامۂ غدر میں یہ بھی رام پور آئے تھے۔ نواب مرزا خاں داغ ان سے بہت محبت کرتے تھے، بھائی کے ساتھ یہ بھی نواب کلب علی خاں کے ساتھ سفر حجاز میں تھے اور حج سے مشرف ہوئے، شاغل کی پروازِ طبع داغ سے علٰحدہ ہے۔

رام پور میں (۱۸۹۱ء[1]) شاغل کا مرتبۂ استادی امیر، جلال و تسلیم کے برابر تسلیم کیا جاتا تھا، نواب مرزا خاں کے سفر کلکتہ جون ۱۸۸۲ء سے قبل یہ سفر بنگالہ کر چکے تھے، داغ اپنے مکتوب[2] ۱۰ اگست ۱۸۷۹ء میں نواب کلب علی خاں کو دہلی سے تحریر کرتے ہیں

"چوں برادرم آغا مرزا ہنوز از مقام ڈھاکہ دریں جانہ رسیدہ است و بغیر تاں نہایت ہرج کارہاست و جواب تار برقی ہم نرسیدہ است کمال تفکر لاحق گردید۔"

ان کے بیٹے محمد غالب مرزا عرف امراؤ مرزا داغ (اپنے چچا) کے ساتھ حیدر آباد دکن جا کر مقیم ہو گئے تھے مگر شاغل کی قناعت پسند طبیعت نے رام پور کو نہیں چھوڑا، بزریا ہمت خاں میں مکان تھا، محمود خاں محمود رام پوری (شاگرد داغ) سے خصوصی تعلقات تھے، نہایت خاموش، متین طبیعت پائی تھی، دیوان موجود تھا مگر ان کے انتقال کے بعد مرزا خورشید عالم ان کے اخیافی بھائی نے حاصل کر لیا، معلوم نہیں پھر کیا ہوا۔ ۱۳۱۵ھ میں بعمر ۹۹ سال رحلت کی اور مزار مولانا[3] جمال الدین صاحب کے قریب دفن ہوئے مولوی الٰہی بخش غریب شاگرد امیر مینائی نے ان کی یہ تاریخ وفات کہی ہے :-

عجب تھے شاعرِ نامی، عجب تھے رمزداں فاضل سخن میں، فقر میں اک صاحبِ ادراک تھے شاغل
جہاں میں جس طرح وہ آشنائے بحرِ عرفاں تھے محیطِ شاعری میں ایسے ہی تیراک تھے شاغل
غریب اس دارِ فانی سے گئے جب سوئے جنت وہ کہی تاریخ یہ میں نے، بدی سے پاک تھے شاغل
۱۶ ۱۳۱۵ھ ۱۳۳۱

انتخاب کلام یہ ہے :-

نیچی نظروں سے نہ ہر اک کو خدا را دیکھئے خاک میں مل جائے گا سارا زمانا دیکھئے
کیا کہوں گا داورِ محشر نے گر اتنا کہا لیجئے یہ نامۂ اعمال اپنا دیکھئے
گو تڑپتا ہے وطن جانے کو جی شاغل مگر دیکھی ہے جس کی بہار، اُس کی خزاں کیا دیکھئے
بتائیں کس زباں سے ہم خزاں دیدہ وطن اپنا نہ اُجڑے یوں کسی کا جس طرح اُجڑا وطن اپنا
آخر کوئی حد بھی ترے اے عمرِ رواں ہے ہر دم کا سفر اب تو مسافر پہ گراں ہے
کیوں نہ ہو ناز مجھے حالِ زبوں پر اپنے جو مجھے دیکھنے آئے گا وہ رو جائے گا
گر یہی خود روی دل ہے تو شاغل اک دن دو جہاں سے تجھے کمبخت یہ کھو جائے گا
اک دل ملا ہمیں جو کبھی شادماں نہیں اک دل اُنھیں ملا کہ غمِ دو جہاں نہیں

---

[1] سوانح عمری امیر (آہ) صفحہ ۲۴ و ۲۵ - [2] انشائے داغ صفحہ ۱۳ و ۱۴ - [3] خیابانِ مسرت - مخطوطہ

غم نے جینے نہ دیا شوق نے مرنے نہ دیا — ایک دم چین سے ان دو نے گزرنے نہ دیا
دیکھ لیتے دمِ آخر تجھے ہم جی بھر کے — اتنا وقفہ تری سفاک نظر نے نہ دیا
قیامت میں وہ میرا منہ تکیں اور خوش نگاہی سے — خدا کے واسطے میں باز آیا دادخواہی سے
کیا انفصالِ حشر کیا اک نگاہ میں — دیکھا جدھر کو جان نہ تھی دادخواہ میں
وہی کوچہ، وہی قاتل، وہی دشمن، وہی رشک — لے چلے کس طرف اے حضرتِ دل تم مجھ کو
ملے جو ہمدمِ دیرینہ کوئی تو پوچھیں — ہم اپنے دل پہ بھی، رکھتے تھے اختیار کبھی

شبیر - صاحبزادہ محمد شبیر علی خاں خلف نواب کلبِ علی خاں خلد آشیاں ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوئے چار سال کے نہ ہوئے تھے کہ مہربان باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، کتب درسی کی فراغت کے بعد شعر گوئی شروع کی، فصیح الملک داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے ان کا کلام بیشتر وارداتِ قلبی کا ترجمان ہے ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۲ء تک دہلی میں مقیم رہے اور بیخود دہلوی سے تلمذ اختیار کیا پھر رام پور آکر آنریری مجسٹریٹ ہوگئے ریاست رام پور سے وظیفہ پاتے تھے، معاصرین سے بہت خوشگوار تعلقات تھے ۴۹ سال کی عمر میں طویل علالت کے بعد ۱۹۳۱ء میں انتقال کیا، دو دیوان قلمی موجود تھے مگر ضایع ہوگئے، شاگردوں میں جلیل احمد خاں جلیل نعمانی و جمیل احمد خاں جمیل و ضبط ربانی وغیرہ ہیں چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں :-

مری بلا سے گرے برق یا چلے آندھی، — غمِ آشیاں کا ہو کیا، میں جب آشیاں میں نہیں
مجھ سے حالِ دلِ بیمار سنایا نہ گیا — جب وہ آئے مرے گھر ہوش میں آیا نہ گیا
اُس کا شکوے پر یہ کہنا، دل میں کٹ جا مرا — شکوہ کس منہ سے کیا، چاہا تھا کس دل سے مجھے

عظمت - محمد عظمت علی خاں فرزند دوم اصغر علی خاں، ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ کو رامپور میں پیدا ہوئے، فارسی عربی کی درسی کتب متداولہ، مولوی حسن علی اور مولوی ولی محمد خاں بسمل سے پڑھیں۔

اس زمانہ میں رام پور اہلِ کمال کا مخزن تھا گھر گھر شعر و شاعری کا چرچا تھا یہ بھی نواب مرزا خاں داغ کے شاگرد ہوگئے، مغرب سے دس گیارہ بجے شب تک اُستاد کی صحبت میں رہتے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں ریاست کی فوج میں ملازم ہوگئے، ۱۸۸۲ء میں مہاراجہ اندور، اپنے ساتھ اندور لے گئے، وہاں مختلف اعلیٰ عہدوں پر سرفراز ہوئے - ۶ نومبر ۱۹۰۶ء کو اندور ہی میں پاؤں کے زخم سے انتقال ہوا۔

دیوان قلمی موجود تھا جو اب غائب ہے - نمونۂ کلام یہ ہے :-

راتیں گزر ہی جائیں گی، دن کٹ ہی جائیں گے — اے سوزِ ہجر، صبر محبت کی جان پر
اب رشکِ غیر ہے نہ تری التجا مجھے — قسمت سے مل گیا دلِ بے مدعا مجھے
وہ بھی نکل کے سینے سے لب تک نہ آسکی — جس آہِ دل گداز کا تھا آسرا مجھے
عظمت یہ بے خودی نہیں بے وجہ بے سبب — پھر یاد کوئے یار کی آئی ہوا مجھے

فیروز - فیروز شاہ خاں خلف اکبر شاہ خاں، ۱۸۶۰ء میں آپ رام پور میں پیدا ہوئے - کتب درسی مختلف اساتذہ سے پڑھیں شاعری کا شوق ہوا تو نواب مرزا خاں داغ دہلوی کو استاد بنایا - مشقِ سخن اس قدر کی کہ نوجوان طبقۂ شعراء میں خاص درجۂ امتیاز حاصل کرلیا - چنانچہ ۱۸۹۱ء میں ایک مجلس ادب بھی قایم کی، ایک علمی و ادبی رسالہ جاری کیا جس کا نام "چودھویں صدی (۱۳۰۸ھ)" تھا - فصیح الملک کے خصوصی شاگردوں میں تھے جب خلد آشیاں کے انتقال کے بعد داغ رام پور سے چلے گئے تو عزیز شاگرد سے مراسلت کا سلسلہ جاری رکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی باعث فیروز نے استاد کے گرامی نامہ کا جواب نہ دیا تو اُس کی شکایت فصیح الملک داغ

نے امیر مینائی کو لکھی۔

داغ دورانِ قیام رامپور میں خطوط کا جواب اکثر انھیں سے لکھواتے تھے، چنانچہ ان خطوں کی نقلیں اب برآمد ہوئی ہیں اور (مولانا عرشی ان خطوں پر مضمون لکھ چکے ہیں) تاریخ گوئی میں بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

تری آنکھوں میں ہے اعجاز کا انداز نیا — مجھ کو جینے نہ دیا غیر کو مرنے نہ دیا
کیا پوچھتے ہو مجھ سے مرے دل کی آرزو — خود دیکھ لو، فقیر کی صورت سوال ہے
دردِ دل سُن کے اُسے رحم کچھ آہی جاتا — داستاں غم کی مگر مجھ سے سُنائی نہ گئی
پھر ہو رہی ہیں وحشتِ دل میں ترقیاں — پھر آرہا ہے باغ میں موسم بہار کا

گوہر۔ ذوالفقار علی خاں خلف عبدالعلی خاں، انگریزی، اُردو، فارسی میں اچھی استعداد ہے، مولانا محمد علی جوہر کے برادر بزرگ اور قادیانی طبقہ کے ممتاز افراد میں شمار ہوتا ہے آج کل راولپنڈی میں مقیم ہیں، داغ کے قیام رام پور کے زمانہ میں شاگرد ہوئے مولانا محمد علی مرحوم اس واقعہ کی تفصیل اس طرح لکھتے ہیں:-

"خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا شوق ہوا تین چار عزیز داغ کے شاگرد ہوگئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں اور اُن کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق تھے، گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کردیا تھا تاکہ وظیفہ محض کارِ بے کاراں کی نذر نہ ہو یہ میرے مکان کے عقب میں (اصطبل) تھا اس لئے روز ان کی زیارت یوں ہی ہوجاتی تھی اُس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا"

گورنمنٹ کی ملازمت میں رہ کر انسپکٹر آبکاری کے عہدہ سے پنشن لی، فصیح الملک کے خاص شاگردوں میں شمار ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے

مجھے اے ضبطِ غم سر پھوڑنے دے شور کرنے دے — مجھے رو رو کے مرنا ہے مجھے رو رو کے مرنے دے
دلِ بیمار تیرے حلقۂ گیسو سے کیا نکلے — یہ ہے قسمت کا پھندا جو نہ جینے دے نہ مرنے دے
کمی کرنا نہ تو اے آبِ خنجر تشنہ لب ہوں میں — مرے سر سے اگر پانی گزرتا ہے گزرنے دے

محمود۔ محمود علی خاں خلف مولوی اشرف علی خاں، رام پور میں ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے، کتب فارسی و عربی مختلف اساتذۂ رام پور سے پڑھیں اور فارسی میں اشعار موزوں کرنے لگے، ان کے استاد سید منصور علی نے مادری زبان میں شعر کہنے کا مشورہ دیا نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے آپ کے والد کے خصوصی تعلقات تھے۔ اس لئے داغ کے شاگرد ہوگئے۔ آپ روزانہ استاد کے یہاں جاتے اور استاد ان پر شفقت فرماتے، ۱۸۸۸ء میں جب رام پور سے فصیح الملک رخصت ہوئے تو بھی اصلاح کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ ۱۳۱۰ھ میں یہ حیدر آباد پہونچے اور میر محبوب علی خاں مرحوم سے مشاعرہ میں داد حاصل کی، حیدر آباد میں ان کی شاعری کا چرچا ہونے لگا۔ آغا مرزا شاغل مرحوم سے بہت گہرے تعلقات تھے بعد نماز مغرب آجاتے اور رات کے گیارہ بجے تک آپ کے مکان پر بیٹھے رہتے، ایک مرتبہ شاغل مرحوم سے فصیح الملک کچھ کشیدہ ہوگئے آپ نے اپنی غزل کے ساتھ ۹ رجب ۱۳۱۱ھ شاغل مرحوم کی غزل سے مقطع نکال کر برائے اصلاح بھیجی، فصیح الملک تاڑ گئے اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"تم نے آغا صاحب کی غزل مقطع نکال کر بھیجدی تھی مگر ہم سمجھ گئے"

ان کی ایک غزل پر اصلاح کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:-

"دونوں غزلیں کیا خوب ہیں خصوصًا پہلی غزل پر تو مجھ کو بھی رشک آیا"

اس غزل کا مطلع یہ ہے:-

کہتے ہیں کہتے ہو کیا جی سے گزرنے کے لئے
ہم سلامت ہیں تو ہیں سیکڑوں مرنے کے لئے

مکتوب ۲۰ رمئی ۱۸۹۷ء میں اس غزل کے متعلق جس کا مطلع ذیل میں درج ہے لکھتے ہیں:-

"کیا خوب غزل کہی ہے ایسی غزل کوئی اور کہے تو جانوں"

دو فتنہ گر ہیں ایک مرا دل ہے کیا کرے
تم سے گلہ کرے کہ فلک سے گلا کرے

رام پور میں آپ کے دم سے شاعری کا کافی چرچا رہا، سیکڑوں شاگرد ہوئے جن میں قابلِ ذکر رشید احمد خاں رشید، ابراہیم علی عرف بدن خاں قہر، سید حامد علی شرف زیدی اور صاحبزادہ واجد علی خاں عرف اچھن صاحب اشک ہیں۔

۱۹۳۴ء مطابق ۱۲ رشعبان ۱۳۵۳ھ میں انتقال ہوا۔ دیوان قلمی آپ کے بھتیجے قہر رامپوری کے پاس موجود ہے۔

انتخاب کلام یہ ہے:-

آنسو بھرے ہیں آنکھ میں اُس مستِ حُسن کی
لبریز کس کی عمر کا پیمانہ ہوگیا،

میں کچھ اس طرح ترے در سے پلٹ کر آیا
کہ مجھے دیکھ کے غیروں کا بھی جی بھر آیا

اب ہے یہ ضعف کی حالت، کہ ترستے ہیں ہم
ہاتھ اپنے دلِ بیتاب پہ دھرنے کے لئے

جب وہ فرماتے ہیں کیوں جیتے ہو کہ دیتا ہوں
آپ کی جان سے دور، آپ پہ مرنے کے لئے

اُلفت میں جو ہو جاتا ہے وہ حال ہے میرا
یہ دیکھنے والے مجھے کیا دیکھ رہے ہیں

تم شکل سے ہو ہماری، بیزار،
اللہ اب ایسے ہوگئے ہم،

جب کہا اُس نے آج کیوں چپ ہو
پھر شکایت کا حوصلا نہ ہوا،

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ہم وحشت میں،
ہائے دامن نہ ہوا، ہائے گریباں نہ ہوا

زاہد یہ چھیڑ خوب نہیں ہے خدا سے ڈر
توبہ کے بعد پوچھنا میخوار کا مزاج

پہچان کی جو بات ہے بس وہ نہ پوچھئے
یہ کہدیا کہ آتے ہیں دشمن کے گھر سے آپ

یہ تلون ہو تو کیا لطفِ اسیری صیاد
کہ ادھر قید کیا اور اُدھر چھوڑ دیا،

نجف ۔ حافظ محمد علی نجف خلف حافظ علی احسن قاصر۔ ۱۲۶۶ھ میں پیدا ہوئے، ۱۴ برس کی عمر میں کتب فارسی اور صرف ونحو عربی سے فراغت پائی۔ ۱۸۶۹ء میں اپنے استاد خواجہ محمد بشیر کے پاس آرہ چلے آئے۔ دو سال تک ان کے پاس رہے اور لوٹے، کچھ دنوں رام پور رہ کر ۱۸۷۲ء میں کلکتہ گئے اور وہاں مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔

جون ۱۸۸۲ء میں فصیح الملک داغ کے جانے پر جو مشاعرے کلکتہ میں منعقد ہوتے تھے ان کے مہتمم یہی ہوتے تھے ۱۲۹۶ھ میں فصیح الملک داغ کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگئے، ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء میں داغ کے سفر کلکتہ کے بعد شرکاء مشاعرہ کے حالات میں ایک تذکرہ غنچۂ ارم کے نام سے کلکتہ سے شایع کیا، نواب کلب علی خاں نے رام پور آنے پر روک لیا اور سالانہ وظیفہ مقرر کردیا۔

۱۳۰۶ھ میں انتقال ہوا، دیوان قلمی ضایع ہوگیا۔ رنگ کلام یہ تھا:-

تجھے کھلتی جب حقیقت مرے دردِ غم کی ناصح
ترے پہلو میں جو میرا دلِ بیقرار ہوتا

تصویر دل کی پھر گئی آنکھوں کے سامنے
رُخ پر جو اُن کے زلفِ معنبر بکھر گئی

کل تھی سینے میں جستجو دل کی،
آج پہلو میں ہے جگر کی تلاش

آخر ایام جدائی کی بھی حد ہے کہ نہیں،
کب تک اللہ رہے گی یہ مصیبت باقی

وفاؔ - حکیم مولوی عبدالہادی خاں خلف یعقوب خاں ۱۸۸۲ء رام پور میں پیدا ہوئے اور علوم متداولہ میں جلد ہی فراغت حاصل کرلی حکمت وفلسفہ میں مولوی عبدالحق خیر آبادی سے تکمیل کی، طب اپنے ماموں حکیم محمد حسین خاں سے پڑھی شاعری کا شوق ہوا تو ابتدائی چند غزلیں فصیح الملک داغؔ کو دکھائیں پھر امیر مینائی سے تلمذ اختیار کیا لیکن اپنی جدت پسند طبیعت کے باعث غالبؔ و مومنؔ کے رنگ میں کہنے لگے علیگڈھ میں بہ سلسلہ مطب قیام تھا، یہیں مولانا حسرتؔ موہانی مرحوم سے تعلقات دوستانہ استوار ہوئے، رام پور میں بیمار رہ کر ۱۳۴۳ھ میں انتقال ہوا، دیوان طبع ہوگیا ہے - چند شعر رنگِ داغؔ کے یہ ہیں :-

مانا کہ میرے پاس تک آیا نہ جائے گا — کیا غیر سے بھی ہاتھ اُٹھایا نہ جائے گا

ہے یہی مستی بے جا تو خدا خیر کرے — اُن کے ہاتھوں سے نکل جائے نہ دامن اُنکا

یہ بے کسیِ عشق وفا خاک میں مل جائے — غیروں سے مرے مرنے کا چرچا نہیں ہوتا

پلایا زہر مجھ کو غمخواری کے پردے میں — جو میرے دوستوں سے ہو چکا دشمن سے کیا ہوگا

ہائے اس بے کسیِ عشق پہ جی بھر آیا — آپ نے وعدہ کیا اور مجھے باور آیا

کلبِ علی خاں فایقؔ

کیا آپ کو معلوم ہے

کہ :-

(۱) مسلم حکومتوں میں ایک حکومت اتجہ کی بھی تھی جس نے دو سو سال تک سلطنت کی

(۲) علوئین کی دو شاخیں تھیں، حسنی اور حسینی - جن میں سے حسنی شاخ کے بارہ خاندانوں نے اور حسینی شاخ کے سات خاندانوں نے علحدہ علحدہ حکومتیں قایم کیں

(۳) مسلم حکمراں خاندانوں میں ایک خاندان کا نام دانشمندیہ بھی تھا جس نے صلیبی لڑائیوں میں بڑا نمایاں حصہ لیا اور بازنطینی حکومت کی بنیاد ہلا کے رکھدی

(۴) خلفاو راشدین کے بعد جب بہ سلسلۂ فتوحات مجاہدین اسلام یورپ، افریقہ اور ایشیا کی طرف بڑھے تو انھوں نے کہاں کہاں اپنی حکومتیں قایم کیں، ان کے کیا نام تھے اور ان کا کیا انجام ہوا

(۵) جب اندلس کی اموی حکومت کو زوال ہوا تو اسپین میں کتنی چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں علحدہ علحدہ قایم ہوگئیں اور انکا کیا انجام ہوا

(۶) کہ جن لوگوں کو مملوک یا غلام کے حقیر لفظ سے یاد کیا جاتا ہے، ان کا موقف اسلام نے اتنا بلند کردیا تھا کہ انھوں نے دنیا میں متعدد زبردست حکومتیں قایم کیں اور تہذیب وثقافت کی نشرواشاعت میں نمایاں حصہ لیا — یہ اور اسی قسم کے سیکڑوں سوالات کا جواب اگر آپ چاہتے ہیں تو — نگار کے آیندہ سالنامہ "**فرمانروایانِ اسلام**" نمبر کا انتظار کیجئے جو "تاریخ اسلام" کی ایک "انسائکلوپیڈیا" ہوگا -

منیجر

ڈالر اور اسٹرلنگ

(مالیاتی و تجارتی دُنیا میں)

مالیاتی و تجارتی نقطۂ نظر سے اس وقت دنیا کے ممالک دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک امریکہ، جس کا کاروبار ڈالر میں ہوتا ہے اور دوسرا وہ جن کا معیاری سکہ پونڈ (اسٹرلنگ) ہے۔ اسٹرلنگ کے معیار سے تجارت کرنے والے ممالک جن میں کناڈا کے علاوہ دولت مشترکہ کے تمام ممالک شامل ہیں "اسٹرلنگ ایریا" یا اسٹرلنگ براوری والے ممالک کہلاتے ہیں چونکہ اسٹرلنگ کا ہر ملک کے سکہ سے ایک مقررہ قیمت پر تبادلہ ہوسکتا ہے۔ اس لئے تجارتی تعلقات کے قیام کی غرض سے اسٹرلنگ برادری والے ملکوں کو معقول نقد سرمایہ بصورت اسٹرلنگ ولایت میں رکھنا ضروری ہے۔ تاکہ آپس میں تجارت آسانی سے ہوسکے مگر اس مسئلہ کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے پہلے تجارت کے چند اصول جان لینا ضروری ہیں۔

تجارت کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو ملک کے اندر کی جاتی ہے۔ دوسری وہ جو دوسرے ملکوں سے تعلق رکھتی ہے۔ ملک کے اندر جب ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں سامان منگایا یا بھیجا جاتا ہے تو قیمت کی ادائی کے سلسلہ میں کوئی دقت نہیں پیش آتی کیونکہ پورے ملک میں ایک سکہ رائج ہے اور بنکوں کے ذریعہ سے روپیہ بآسانی ادہر سے اُدہر منتقل ہوجاتا ہے۔ لیکن بین الاقوامی تجارت کا اصول دوسرا ہے اور وہ یہ کہ خریدکرنے والا ملک مال کی قیمت اپنے سکہ میں ادا نہیں کرتا، بلکہ اُسی ملک کے سکہ میں ادا کرتا ہے جہاں سے مال خریدا گیا ہے یا پھر سونے کی صورت میں۔ فرض کیجئے کہ بہ سلسلۂ تجارت امریکہ کا مطالبہ ہمارے ذمہ دولاکھ ڈالر کا ہے، جو شرح تبادلہ کی رو سے پانچ لاکھ روپیہ ہوتا ہے، تو ہم اس قرضہ کو دو طرح ادا کرسکتے ہیں ایک یہ کہ ہم اپنے ملک سے اتنا سامان بھیجیں کہ اس کی قیمت خرید ہمارے سکہ میں پانچ لاکھ روپیہ اور امریکہ کے سکہ میں دولاکھ ڈالر ہو، یا پھر اسی قیمت کا اسٹرلنگ امریکہ کے حساب میں منتقل کرادیں جسے امریکہ اسٹرلنگ ایریا والے ملک سے سامان خریدنے میں خرچ کرسکتا ہے۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے تاریخ کے چند اوراق پلٹنا ضروری ہیں پہلی جنگ عظیم سے قبل اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ ملکوں کی باہمی تجارت کا حساب وکتاب برابر رہنا چاہئے کیونکہ مقروض ممالک کو قرضہ کی ادائی کے لئے سونا ملک سے باہر بھیجنا پڑتا تھا اور یہ عموماً پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ کیونکہ سونا ہر ملک کو عزیز ہوتا ہے۔ پھر بھی تجارت کا پلہ برابر رکھنے کے لئے سونے کی لین دین ہوتی رہتی تھی لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد ہر ملک میں یہ کوشش کی جانے لگی کہ ملک کی قیمتوں میں زیادہ فرق نہ ہو اور سونے کی آمدورفت سے جو اثر اشیاء کی قیمتوں پر ہوتا ہے وہ زیادہ اور جلد جلد نہ ہو۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل Gold Standard کے زمانہ میں یعنی اس زمانہ میں جب سونے کی موجودہ مقدار کے لحاظ سے سکے جاری کئے جاتے تھے، سونے کی آزادانہ آمدورفت ہر ملک کی تجارت کو برابر اور متوازن رکھنے میں بہت مدد دیتی تھی۔ مثال کے طور پر الف اور ب ممالک لے لیجئے اگر الف، ب ملک کا مقروض ہوجاتا ہے تو اس کا سونا ب ملک میں جانے لگے گا اس کا نتیجہ ہوگا کہ وہاں سونا پہونچتے ہی روپیہ کی مقدار بڑھنے لگے گی جسے اصطلاح میں (Inflation) یا افراطِ زر کہتے ہیں۔ یعنی دو روپیہ کی چیز چار روپیہ میں ملنے لگے گی۔ یہ صورت پیدا ہوتے ہی ب میں الف کی چیزیں بکنے کے لئے زیادہ آنے لگیں گی۔ جبکہ ب کی بھیجی ہوئی چیزیں الف میں قیمت کم ہوجانے کی بنا پر

کم جائیں گی۔ اور الف سے آئی ہوئی چیزوں کی قیمت ادا کرنے کے لئے ب کا سونا الف ملک میں جانے لگے گا۔ غرض کہ یہ سلسلہ یونہی قایم رہتا تھا۔ اور سونے کی آمد و رفت دونوں ملکوں کی قیمتوں کو گھٹاتی بڑھاتی رہتی تھی اور اس طرح قیمتوں کی کمی وبیشی کا اثر، پیداوار کی لاگت پر پڑتا تھا۔ جس سے مزدوری یا اُجرت کم ہوجاتی اور عوام میں بےچینی کا باعث بن جاتی، اسی زمانہ میں ٹریڈ یونین وغیرہ کے بن جانے سے نہ تو اُجرت کو بے انتہا گھٹایا بڑھایا جاسکتا تھا اور نہ یہ ممکن تھا کہ ایک ہی قسم کے کارخانوں میں کسی جگہ اچھی تنخواہیں ہوں اور کسی جگہ کم۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد تجارت کے استحکام کی جگہ ملک کی اندرونی قیمتوں کے استحکام نے لے لی اور کچھ عرصہ کے بعد گولڈ اسٹنڈرڈ کی جگہ Gold Exchange Standard نے لے لی۔ اس طرح دوسرے طریقہ میں یہ ضروری نہیں کہ ہر ملک سونے سے براہ راست متعلق ہو بلکہ وہ دوسرے ملک کے سکہ کے ذریعہ سے سونے سے مقررہ قیمتی توازن رکھتا ہے مثلاً ہندوستان جو سونے سے براہِ راست متعلق نہیں ہے بلکہ انگلستان کے ذریعہ سے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس طریقہ میں ملکوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ سونا بھیجنا ضروری نہیں رہ جاتا۔ تیسرے یہ کہ اسی طریقہ میں یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف سونے وچاندی کا سکہ رائج ہو بلکہ ان کی بیشتر جگہ کاغذ کے نوٹ اور چیک مروجہ ہوسکتے ہیں۔

یہ سمجھنے کے بعد کہ 'اسٹرلنگ ایریا' سے کیا مراد ہے یہ سمجھنا ضروری ہوجاتا ہے کہ اس ایریا سے باہر رہنے والے ملکوں کی اور اس کی تجارتی حالت کیا ہے اور کن قوانین پر عمل کیا جاتا ہے —— اس کو سمجھنے کے لئے دُنیا کے ملکوں کو چار حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

(الف) وہ ممالک جو کمیونسٹ ہیں یا کمیونسٹ ممالک کے زیر اثر ہیں ان میں روس اور چین اہم ہیں۔ ان ممالک کے تجارتی تعلقات باہر کے دوسرے ملکوں سے بہت کم ہیں۔

(ب) دولت مشترکہ کے ممالک یا وہ جو انگریزوں کے قبضہ میں تھے اور اب بھی ان کے زیر اقتدار ہیں۔ ان میں ہندوستان پاکستان، جنوبی افریقہ، سیلون، آسٹریلیا، کناڈا شامل ہیں۔ آسٹریلیا اور کناڈا کے علاوہ باقی تمام ممالک غیر ترقی یافتہ کہلاتے ہیں۔ ان کی معاشی اور تجارتی حالت بہت کمزور ہے آبادی گنجان ہے زیادہ تعداد غریبوں کی ہے نباتات اور معدنیات کی کثرت کے باوجود ان سے پورا فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا الغرض ترقی میں یہ ممالک بہت پیچھے ہیں۔ اس لئے ان کو ترقی یافتہ ملکوں کی مدد بہت ضروری ہے۔

(ج) امریکہ اور لیٹن امریکہ (جنوبی امریکہ اور جزائر کے ممالک) آج امریکہ کی حالت تجارتی، صنعتی اور مالی اعتبار سے بہت مضبوط ہے۔ سوا چند خام اشیاء کے اس کو دوسرے ملکوں سے کسی چیز کے خریدنے کی ضرورت نہیں۔ برخلاف اس کے غیر ترقی یافتہ ممالک کو امریکہ کے بنائے ہوئے سامان کی سخت ضرورت ہے۔

(د) اس ضمن میں وہ ممالک سمجھے جاسکتے ہیں جو پہلے تینوں میں سے کسی میں بھی شامل نہیں ہیں۔ مثلاً اسپین، اٹلی، سوئٹزرلینڈ وغیرہ۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد تین موقعوں پر اسٹرلنگ ایریا کے ملکوں کو امریکہ کے ساتھ تجارت کرنے میں سخت نقصان اُٹھانا پڑا چونکہ لڑائی کے ختم ہوتے ہی یورپ کے ملکوں کو اور ان ممالک کو جہاں لڑائی ہوئی تھی اپنی معاشی زندگی کو سدھارنے، تباہ وبرباد مقامات کو پھر سے بسانے، بیکاروں کو کام سے لگانے اور اس طرح کے دوسرے تعمیری کام کرنے کے لئے سامان اور قوت خرید کی سخت ضرورت تھی۔ اس لئے بہت سے ممالک امریکہ کے مقروض ہوگئے، یعنی امریکہ کے تجارتی منافع کا پلہ بھاری ہوگیا اور اسٹرلنگ ایریا کے ملکوں کا ہلکا۔ اس حالت کو سمجھنے کے لئے دنیا کی تجارت کو دو حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک حصّہ کا سکہ پونڈ ہے اور دوسرے کا ڈالر۔ اگر دونوں ملکوں کی خرید و فروخت قیمتوں کے لحاظ سے برابر رہے تو یہ تجارت متوازن

پھیلائے گی اور دونوں ملکوں میں سے کوئی کسی کا مقروض نہ ہوگا مگر ایسا ہونا یقینی نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے پونڈ والا ملک زیادہ مال خریدلے اور ڈالر والا ملک اتنا نہ خرید سکے کہ تجارت متوازن رہے۔ ایسے حالت میں پونڈ والا ملک ڈالر والے ملک کا مقروض ہوجائے گا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ گولڈ اسٹنڈرڈ کے زمانہ میں سونے کی آزادانہ آمد و رفت اس کمی و بیشی کو پورا کردیتی تھی مگر اس کے بعد جب اسٹرلنگ ایریا کی تجارت ناموافق ہوئی تو امریکہ کا قرضہ ان ممالک پر بڑھنے لگا۔

۱۹۴۷ء میں کئی International Monetary organisations (اس میں بہت سے بین الاقوامی بنک اور ادارہ شامل ہیں جن کا مقصد تجارتی تناؤ کو کم کرنا ہے) کے وجود میں آنے سے تقریباً ۲۳ کرور ۸۰ لاکھ ڈالر اسٹرلنگ ایریا کے ممالک کو ڈالر اور سونے کی شکل میں دینے پڑے اور پہلی دفعہ ڈالر کی کمی ان ممالک نے محسوس کی جو امریکہ سے تجارتی کاروبار ضرور رکھتے تھے۔ ان ناموافق تجارتی حالت کو بہتر بنانے کے لئے یا دوسرے الفاظ میں ڈالر حاصل کرنے کی خاطر اسٹرلنگ ایریا کے ممالک نے تین باتوں پر عمل کرنا شروع کیا۔ پہلا یہ کہ اپنی صنعتی اور زراعتی پیداوار بڑھانے لگے تاکہ امریکہ سے کم سے کم چیزیں خریدلیں۔ دوسرا یہ کہ اپنے قدرتی ذرائع پیداوار زاید سے زاید کام میں لانے کی کوشش شروع کی۔ تیسرا یہ کہ امریکہ کو اپنا مال زیادہ بھیجنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس طرح ایک حد تک حالت بہتر ہوگئی مگر ۱۹۴۹ء میں ایک بار پھر یہ قرضہ بڑھنے لگا اور تقریباً ۱۹۴۷ء کے قرضہ کے برابر ہوگیا۔ جس سے امریکہ کا سامان خریدنے میں دقتیں پیش آنے لگیں۔ اس مرتبہ یہ کمی اسٹرلنگ ایریا والے ملکوں کے علاوہ دوسرے ممالک نے بھی محسوس کی ——————— مگر سب سے زیادہ مقروض برطانیہ رہا کیونکہ اسٹرلنگ ایریا کا سب سے بڑا رکن یہی تھا اور اس پر سب سے زیادہ خراب اثر پڑنا ضروری تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹ ستمبر ۱۹۴۹ء کو برطانیہ نے اسٹرلنگ (پونڈ) کی قیمت گھٹادی۔ تاکہ سستا ہونے کی وجہ سے امریکہ میں یہاں کا سامان زیادہ بکنے لگے، باہر کی چیزیں ملک میں مہنگی ہونے کی وجہ سے کم خریدی جائیں اور اس طرح برآمد درآمد کے مقابلہ میں بڑھ جائے۔ اس تدبیر سے یہ ہوتا ہے کہ زیادہ مال فروخت ہونے کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ شروع ہوجاتا ہے اور ملک کے اندر بہت سے بیکار لوگوں کو مختلف کاموں میں لگایا جاسکتا ہے۔

جب برطانیہ نے اپنے اسٹرلنگ کی قیمت کم کردی تو پاکستان کے علاوہ اس ایریا کے اور سب ممالک نے بھی اپنے سکوں کی قیمت گھٹادی۔ جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ برطانیہ میں ڈالر کی مقدار بڑھ گئی۔ اور امریکہ کا سامان اسٹرلنگ ایریا کے بازاروں میں کم بکنے لگا۔ اور امریکہ میں باہر کے سامان کی مانگ کچھ بڑھ گئی کیونکہ ان کی قیمتیں کم ہوگئی تھیں۔ مگر اس زمانہ کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ ان ممالک کی جو کچھ بھی حالت سنبھلی وہ صرف Devaluation کا نتیجہ تھی کیونکہ اسٹرلنگ ایریا کے ممالک نے ۱۹۴۹ء میں امریکہ کے بھیجے ہوئے مال کو ۲۵ فیصدی کم خریدنے کی اسکیم پر عمل درآمد شروع کردیا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں کوریا میں لڑائی شروع ہوجانے اور اسرائیل و عرب ممالک میں لڑائی چھڑ جانے کی وجہ سے امریکہ نے ٹین، ربڑ، اون وغیرہ خریدنا شروع کردیا اور اس طرح سے حالات موافق ہوگئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسٹرلنگ ایریا کے ممالک میں ڈالر کا ذخیرہ کافی فراہم ہوگیا۔

ہندوستان کی تجارت پر Devaluation کا پہلا اثر یہ ہوا کہ یہاں کی پیداوار کی مانگ بڑھ گئی جس میں روئی اور جوٹ کو خاص اہمیت حاصل ہے، لیکن چونکہ پاکستان اور ہندوستان تقسیم کے بعد جوٹ پیدا کرنے والے سارے حصے پاکستان میں چلے گئے تھے۔ اس لئے پاکستان نے موقع سے فایدہ اٹھاتے ہوئے جوٹ کی قیمت بڑھادی اور ہندوستان کو اس مد میں روپیہ کی قیمت گھٹا دینے سے کوئی فایدہ نہ ہوا۔ چائے میں البتہ تھوڑا فایدہ ہوا۔ لیکن مال کی برآمد کے جد میں اس عمل سے خاص فایدہ نہ ہوا۔

۱۹۵۱ء میں ڈالر کی کمی پھر محسوس کی گئی کیونکہ اسٹرلنگ ایریا کے ملکوں میں امریکہ کی مشینوں، مشینی پرزوں، موٹر، حل، انجنوں اور بجلی کے سامان کی مانگ بڑھ گئی تھی اور ساتھ ہی امریکہ سے جو ڈالر حاصل کرنے کا ذریعہ ہاتھ آیا تھا وہ بھی جاتا رہا تھا۔ ایران کے تیل کے کارخانے برطانیہ کے پاس نہ رہے اور تیل خریدنے کے لئے بھی کچھ اپنے پاس سے برطانیہ کو خرچ کرنا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈالر کا ذخیرہ جو پہلے ہی بہت کم رہ گیا تھا اور زیادہ گھٹنے لگا۔ اور اسٹرلنگ ایریا کے ممالک خاص طور پر برطانیہ کو نہ صرف امریکہ بلکہ دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت کرنے میں مشکلات پیدا ہونے لگیں اور باہری مدد کی ضرورت روز بروز بڑھنے لگی۔ یہ صورت امریکہ کے لئے بھی پریشان کن تھی۔ کیونکہ امریکہ جن ملکوں سے تجارت کرتا تھا۔ اگر ان کے پاس امریکہ کا سامان خریدنے کے لئے ڈالر نہ ہوتا تو پھر امریکہ کو اپنا سامان یا تو مفت بھیجنا پڑتا یا پھر تجارتی تعلقات ختم کر دینے پڑتے، پہلی صورت میں جو نقصان امریکہ کو ہوتا وہ ظاہر ہے اور دوسری صورت میں امریکہ کی حالت اس گولی کھیلنے والے کی سی ہوتی جو سب کی گولیاں جیت کر یا تو کھیل بند کر دینے کا ارادہ کرے یا پھر دوسرے کھلاڑیوں کو اُدھار گولیاں دینے پر راضی ہو جائے۔ ان حالات کے پیش نظر امریکہ نے ضرورت مند ممالک کو امداد پہونچانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ مختلف بنکوں کے ذریعہ صنعتی اور زراعتی امداد کے لئے مشینیں وغیرہ بھیجنا شروع کر دیں۔ اور ساتھ ہی اپنے ملک کے ماہرین فن بھی باہر بھیجے تاکہ وہ جدید منصوبہ بندیوں میں صحیح مشورہ دیں اس تدبیر سے امریکہ کے پیش نظر دو فایدے تھے ایک یہ کہ وہ اپنی تجارت کو قایم رکھ سکے گا اور دوسرے یہ کہ وہ ممالک جو امریکہ کا سامان خریدنے پر مجبور ہیں ان پر اپنا سیاسی اثر قایم رکھ سکے گا۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ امریکہ کسی حد تک اپنی اس اسکیم میں کامیاب رہا۔

۱۹۵۲ء میں جو کانفرنس دولتِ مشترکہ کے وزراءِ مالیات کی ہوئی تھی، اس میں بھی یہی مسئلہ زیر بحث رہا، کہ کس طرح اس پریشانی کو دور کیا جا سکتا ہے، اور چند تجاویز بھی وقتی طور پر حالات کو سدھارنے کے لئے پیش کی گئیں۔ مگر یہ بیماری کا صحیح علاج نہیں ثابت ہوا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اگر امریکہ سونے کا نرخ کم کر دے یعنی پہلے جتنا سونا ایک ڈالر میں خریدا جا سکتا تھا اب نصف ڈالر میں ملنے لگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے ملکوں کے پاس ڈالر کی مقدار بڑھ جائے گی اور وہ ممالک جو امریکہ کا مال خریدتے ہیں فایدہ میں رہیں گے، مگر امریکہ کا نقصان لازمی ہے۔ کیونکہ امریکہ کو اپنے مال کی قیمت سونے کو مدنظر رکھتے ہوئے کم ملے گی۔

دوسرا حل یہ ہے کہ اسٹرلنگ ایریا امریکہ سے سامان کی خریداری کم کر دے مگر جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اسٹرلنگ ایریا اپنی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے ایسا کرنے پر قادر نہ ہوگا۔ کیونکہ غیر ترقی یافتہ ممالک بغیر مشینوں کے اپنی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے اور انھیں مجبوراً یہ سامان امریکہ سے لینا پڑے گا کیونکہ اور کوئی ملک یہ سامان بہم نہیں کر سکتا۔

(آنسہ) عایشہ (ام۔اے)

مکتوبات نیاز

(تین حصّوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔

قیمت فی حصہ چار روپیہ، حصۂ سوم میں رنگین گرد پوش بھی ہے اور حضرت نیاز کی تصویر بھی۔

منیجر نگار لکھنؤ

گاہے گاہے باز خواں ——"

شکر ہے اس وقت پاکستان میں "ملاازم" کی کمان اُتر گئی ہے
لیکن پھر چڑھ گئی تو کیا ہوگا ——— ؟

پاکستان کے اربابِ سیاست کے لئے ایک لمحہ فکریہ

اگر آج ہماری قوم سے کفش دوز، پارچہ باف، رنگریز، سونار، لوہار، بڑھئی، معمار وغیرہ معدوم ہو جائیں تو ہماری ضروریات زندگی کو کتنا صدمہ پہونچے اور ان کو جانے دیجئے صرف شاعروں کو لے لیجئے کہ اُن سے زیادہ بیکار جماعت بظاہر کوئی نظر نہیں آتی، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ نہ ہوں تو ہماری بہت سی لطیف صحبتیں ختم ہو جائیں مگر خدا کے لئے کوئی بتائے کہ اگر آج روئے زمین سے اس جماعت کو فنا کر دیا جائے جو ہمارے مذہب و اخلاق کی ضامن بنی ہوئی ہے تو اس سے ملک و قوم کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے

ہر چیز کی اہمیت کا اندازہ اس خدمت کے لحاظ سے متعین کیا جاتا ہے جو اس دنیا میں اس سے متعلق ہوتی ہے، پھر اگر وہ خدمت زیادہ اہم ہے تو اس چیز کا وجود بھی اتنا ہی اہم سمجھا جاتا ہے اور اگر وہ چنداں اہم نہیں ہے تو اس کے وجود کی بھی زیادہ پروا نہیں ہوتی یہاں تک کہ اگر کوئی چیز بیکار ہے تو وہ مٹ جاتی ہے۔

اچھا اب غور کیجئے کہ اس جماعت سے کیا خدمت متعلق ہے یا اس سے دنیا کو کیا فایدہ پہونچ رہا ہے —— انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک وہ جس کا تعلق مادیات سے ہے اور دوسرا وہ جو اخلاقیات سے متعلق ہے، پھر یہ تو ظاہر ہے کہ مادی زندگی کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ نہایت فخر و ناز کے ساتھ دنیا و کاروبار دنیا سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا کرتے ہیں، رہی اخلاقی زندگی سو آج تک یہی نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کس اخلاق کی تعلیم دے رہے ہیں اور دُنیا کا وہ کون سا اخلاق ہے جو انسان کو دنیا سے بیزاری کا درس دے سکتا ہے۔

اسلام کی گزشتہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء اور شاہانِ اسلام مادیات و روحانیت یعنی دنیا و دین دونوں کا مرکز سمجھے جاتے تھے اور اسی لئے اسلام میں قدرتاً وہ اُصولِ زندگی پیدا ہو گئے جو مذہب کا کاروبار دنیا اور ہنگامۂ حیات کے دوش بدوش لیجانے کے ضامن تھے اور یہی سبب تھا کہ اسلام کے عہدِ وسطیٰ میں جو یقیناً اس کا زریں دور تھا، ایک شخص کے لئے یہ متعین کرنا دشوار تھا کہ مسلمانوں کے اصول زندگی میں کس طرح خطِ فاصل کھینچکر اُن کے دین کو دنیا سے تمیز کیا جا سکتا ہے کیونکہ اُنکا بیٹھنا اُٹھنا، کھانا پینا، جاگنا سونا، الغرض دنیا کا ہر دنیاوی عمل مذہب ہی کے لئے تھا، جس طرح اُن کے تمام مذہبی اعمال دنیاوی ترقی کے روح رواں تھے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے حکمراں جماعت اور علماء دین کے گروہ کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر رکھا تھا اور اگر اتفاق سے کوئی قاضی یا مفتی، مولوی یا عالم حکومت کے مصالح کے خلاف کوئی فتویٰ دینے کی جرأت کرتا تھا تو اسے قید و بند میں ڈالا جاتا تھا ممکن ہے کوئی شخص اسے حکومت کی زیادتی یا سلطنت کا ظلم قرار دے، لیکن جہاں تک اصول سیاست کا تعلق ہے اس طرزِ عمل

پر نکتہ چینی کی کوئی گنجایش نہیں پائی جاتی۔ بہر حال مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ مسلمانوں کے عہدِ ترقی میں یہ جماعت کبھی آزاد و خود سر نہیں رکھی گئی اور ہمیشہ اُن کو مجبور کیا گیا کہ وہ حکومت کے مصالح، اور سیاست کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اپنے احکام فقہی میں تبدیلی پیدا کرتے رہیں۔ پھر یہ تو یقیناً ہوا کہ جس چیز کو سلطنت کی مصلحت بتایا گیا وہ بارہا مستبدانہ خود غرضی ثابت ہوئی لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی عالمِ دین نے اس خود غرضی کا احساس کر کے صدائے احتجاج بلند کی ہو اور اس کی زبان کو حرکت کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہو۔

پھر غور کیجئے کہ اگر مسلمانوں کی حکومت بدستور قایم رہتی اور بجائے عیسائی حکومتوں کے آج انھیں کی حکومت روئے زمین پر غالب ہوتی تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت جو حالت ہمارے یہاں کے علماء دین کی نظر آتی ہے اس وقت بھی پائی جاسکتی تھی قیامت تک ممکن نہ تھا کہ وہ زمانے کا ساتھ دینے سے احتراز کرتے اور اُن کو زندہ و سلامت رہنے دیا جاتا کیونکہ ایک پاپائے روم کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی کلیسہ کی دُنیا علٰحدہ قایم کر کے کاروبارِ عالم سے کوئی واسطہ نہ رکھے لیکن ایک مسلمان کے دل و دماغ سے کبھی یہ بات نہیں نکل سکتی کہ اُس کا مذہب اُس کی دنیا سے علٰحدہ کوئی چیز نہیں اور نہ کبھی یہ بات اُس کی عقل میں آسکتی ہے کہ مذہب اسلام کے علاوہ ایک چیز قومیت و وطنیت اور بھی ہے جو غیر مذہب والوں کو بھی اپنے میں شامل کر کے خالص دنیوی تمدنی ترقی کے لئے زبردست مرکزیت پیدا کر سکتی ہے۔

الغرض حکومت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اگر کوئی مذہب چل سکتا ہے تو صرف اسی طرح کہ وہ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے احکام و قوانین میں بھی تبدیلی پیدا کرے ورنہ اس کا فنا ہوجانا بالکل یقینی ہے، چنانچہ آج ترکی و ایران کے حالات کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ وہاں مذہب کی کیا حالت ہے اور علمائے مذہب کس بے چارگی و بے بسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں نہ مسلمانوں کی حکومت ہے نہ اکثریت نہ جہاں علم ہے نہ واقفیت، مولوی جو چاہے کہے جو بدعت جی میں آئے کرتا پھرے، لیکن ترکی و ایران میں تو جا کر کہہ دے کہ بنک میں روپیہ جمع کرنا حرام ہے۔

اب اتنا پڑھنے کے بعد آپ پھر ابتدائی سطور پر غور کیجئے اور ٹھنڈے دل سے فیصلہ فرمائیے کہ اس جماعت سے مسلمانوں کو کیا فایدہ پہونچ رہا ہے یا اس کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ حکومت تو ان کے بس میں نہیں کہ یہ حضرات اس کا ساتھ دیکر عوام پر سلطنت کے اقتدار کو قوی بنائیں اور اس کے عوض میں گرانقدر معاوضہ حاصل کرتے رہیں اور چونکہ یہ خون ان کے منھ لگ گیا ہے اس لئے وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ خود اپنی ہی ذات کو دنیا و دین کا مرکز قرار دیکر عوام کو اپنی طرف بلائیں اور اس غرض کے لئے وہ سب جایز و ناجایز باتیں روا رکھیں جو انکے اسلاف نے شاہانِ اسلام کے لئے روا رکھیں تھیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ایک مولوی کے تمام تعلیمات و نصایح مذہبی کا موضوع صرف مابعد الطبیعیات کی دنیا ہوتی ہے اور وہیں کے خوفناک تاریک مناظر سے ڈرا ڈرا کر وہ اپنی پرستش کرایا کرتا ہے، اس کو مطلق اس سے بحث نہیں کہ دنیا کہاں جارہی ہے، زمانہ کس رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے، جہل و تاریکی کس تیزی سے علم کی روشنی میں پیچھے ہٹ رہی ہے، وہ برابر یہی کہے جائے گا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسی کو برحق جانو، وہ اس سے بالکل ناآشنا ہے کہ اس وقت کے اقتصادی مسایل ہم سے کیا چاہتے ہیں، وہ غریب اس سے مطلق آگاہ نہیں کہ ملک کی سیاسیات کا مستقبل کیا ہے، مخلوط و غیر مخلوط انتخاب کس جانور کا نام ہے، فیڈریشن کیا بلا ہے اور راونڈ ٹیبل کانفرنس کیا، پھر لطف یہ کہ وہ اس جہل پر فخر بھی کرتا ہے۔ اس نادانی پر نازاں بھی ہے اور کہتا ہے کہ اہلِ جنّت تو ایسے ہی سیدھے سادھے بھولے بھالے لوگ ہوتے ہیں درآنحالیکہ یہ جنّت کی مخلوق جو ان معاملات میں اپنے آپ کو اس قدر نیک و بے خبر ظاہر کرنے پر فخر کرتی ہے، کتنی ہوشیار و باخبر ہے غریبوں کا روپیہ وصول کرنے میں اور جاہلوں کا گھر اُجاڑ اُجاڑ کر اپنا گھر بسانے میں۔

جس وقت یہ کسی مجمع میں وعظ فرما ہوتے ہیں تو ان کی صورت و حالت یونان کے اس جیوپیٹر دیوتا کی سی ہوتی ہے، جس کے

ایک ہاتھ میں دوزخ کے انگارے ہیں اور دوسرے میں جنت کی گل فشانیاں اور وہ اپنے آپ کو بالکل مالک و مختار سمجھتے ہیں خواہ چشم زدن میں جلاکر خاکستر کردیں، خواہ بیک جنبش چشم و ابرو ہر ہر ذرہ کو گل و گلزار بنادیں۔

ان لوگوں کی اولین کوشش یہی ہوتی ہے کہ لوگوں کو دُنیا و کسب دُنیا کے خیال سے منحرف کردیں اور اس کے لئے وہ غلط توجیہ و تاویل کے ساتھ کلام مجید کی آیتیں بھی پڑھتے ہیں احادیث نبوی سے بھی استناد کرتے ہیں، اقوال ائمہ کبار بھی سناتے ہیں اور مثنوی مولانا روم کے اشعار بھی خاص لحن کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس تعلیم کا مقصود حقیقی سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ جب لوگ دولت کو حقیر سمجھنے لگیں گے تو نہایت آسانی سے اُن کے حوالہ کردیں گے۔

اسی کے ساتھ وہ دوسری نفسیاتی ضرب یہ لگاتے ہیں کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں اور عہدِ سلف کے اولیاء کرام کے واقعات سناکر ان کے خوارق عادات اور کرامات کی داستانیں سنانے لگتے ہیں کہ انھوں نے کس طرح سیکڑوں سال کی غرق شدہ بارات کو دریا سے زندہ نکال لیا، ایک شخص پر نگاہ ڈالتے ہی کیونکر اس کے دل کا تمام حال بتادیا، کسی کے بھاگے ہوئے غلام کو کس طرح ایک تعویذ لکھ کر واپس بلادیا اور پھر آخر میں وہ سارے وعظ کی تان "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" پر توڑتا ہے اور احمق و جاہل مسلمانوں پر اپنی عظمت و بزرگی، اپنی غیر معمولی قوتِ روحانی اور اپنے محیر العقول کارناموں کا سکہ بٹھاکر آخر کار اُن کی جیبیں خالی کرالیتا ہے۔

تمام دنیا کی قومیں اس اصول پر ترقی کر رہی ہیں کہ عقول انسانی کی تربیت کے لئے تمام موانع کو دور کردینا چاہئے، لیکن یہ فرماتے ہیں کہ نہیں عقلی ترقی روحانی انحطاط ہے اور اب دُنیا میں کوئی شخص کو سوچنے سمجھنے کا مجاز نہیں، جو ہونا تھا ہوچکا، جو کچھ سمجھ میں آسکتا تھا آگیا اور وہ اسی علم و یقین یا ضلالت و گمراہی کو سامنے رکھ کر اپنا دائرۂ عمل قایم کرتے ہیں، چنانچہ ان کی تصنیف و تالیف تبلیغ و اصلاح، پند و ہدایات سب اسی اصول کے تحت ہوتی ہے اور اس دائرہ سے ایک انچ ادھر اُدھر ہٹنا گوارا نہیں کرتے۔

ایک قوم کے اندر انقلاب کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں ایک یہ کہ اس قوم کے اندر حُسنِ اتفاق سے بعض افراد صالح ایسے پیدا ہوجائیں جو قومی جمود کو دور کردیں، یا پھر افراد قوم کے اندر کسی خارجی اثر سے ذہنی اضطراب پیدا ہوجائے۔ امر اول کی تو بظاہر کوئی امید ہندوستان و پاکستان میں نظر نہیں آتی لیکن دوسری صورت کے آثار ضرور رونما ہوچکے ہیں اور ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہے جو علماء دین کی تعلیمات کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگی ہے لیکن چونکہ یہاں انسان کی ذہنی و عقلی آزادی کو گہوارہ ہی سے چھیننا شروع کردیا جاتا ہے اور خدا جانے کتنے زمانہ سے نسلاً بعد نسل اس پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ عادت چھٹتے ہی چھٹتے چھٹے گی۔ الغرض پاکستان و ہندوستان کا مسلمان اس وقت جن راہوں سے گزر رہا ہے وہ اس قدر دشوار گزار ہیں کہ اگر کوئی فوری انقلاب نہایت ہی شدید قسم کا اُن میں رونما نہ ہو تو اُن کے نجات کی کوئی صورت نہیں اور ان کا بالکل وہی حشر ہوگا جو ہسپانیہ کے مسلمانوں کا ہوا کہ چند منہدم آثار تو اُن کے باقی رہ جائیں گے لیکن وہ خود کہیں کچھ نہ ہوں گے۔ ہمارا مولوی یا عالم دین جو بدقسمتی سے ہمارا قاید و رہنما اور ہمارا مصلح بنا ہوا ہے دوزخ و جنّت کی روایات بیان کرنے میں، رات دن لوگوں سے نمازیں پڑھوانے کی فکر میں تو بے شک منہمک نظر آتا ہے لیکن وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہیں کرتا کہ جس قوم سے وہ اپنے لئے لذائذ دنیوی حاصل کر رہا ہے اُس کی اقتصادی حالت کیا ہے اور اس کا انحطاط کس حد تک پہونچ چکا ہے۔

میں کہتا ہوں، بہ آواز بلند کہتا ہوں اور بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ یہ وقت اس بات کے دیکھنے کا نہیں ہے کہ مسلمان نماز پڑھتا ہے یا نہیں، روزے رکھتا ہے یا نہیں، دوزخ و جنّت کا قایل ہے یا نہیں بلکہ صرف یہ سوچنے کا ہے کہ مسلمانوں کے پاس کچھ کھانے کو بھی ہے یا نہیں اگر علماء دین ہمارے حقیقی بہی خواہ ہوتے اور اُن کے دلوں میں ہمارا سچا درد ہوتا تو اس وقت تمام مواعظ مذہبی کو چھوڑ کر صرف اس پر غور کرتے کہ مسلمان اپنا پیٹ کس طرح بھریں اُن کے بچے بھوک کی تکلیف سے کیونکر محفوظ رہیں اور

اُن کی عورتیں کس تدبیر سے اسباب ستر پوشی حاصل کر سکیں - آپ ایک مسلمان کو موٹر پر سوار، نفیس لباس پہنے ہوئے دیکھ کر اس کی خوش حالی و مسرت کا اندازہ کیجئے بلکہ اس کے گھر میں جاکر دیکھئے کہ کیا حالت ہے اور اس کے دل میں سما کر معلوم کیجئے کہ وہ کس تکلیف و عذاب میں مبتلا ہے - پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہمارے اس قائد و رہنما کو ہمارے اس دینی و دنیوی رہبر کو کبھی اس کا خیال ہوا ہے کہ جس وقت وہ اپنے وسیع دسترخوان پر نفیس نفیس غذائیں کھانے میں مصروف رہتا ہے - ٹھیک اسی وقت اس کے پڑوس میں کتنے مسلمان ایسے ہیں جو بھوکے پیاسے پڑے ہوئے ہیں اور کتنے بچے ایسے ہیں جن کی مائیں اپنی خشک چھاتیوں سے ایک قطرہ دودھ کا ان کے منہ میں نہیں ٹپکا سکتیں - جس وقت وہ حریر و کمخواب یا باریک چکن اور ولایتی تنزیب کی اچکن پہن کر ایک ادائے معشوقانہ کے ساتھ موٹر پر سوار ہونے کے لئے گھر سے باہر نکلتا ہے - کیا ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی اس کا خیال اس حقیقت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس قوم کے کتنے افراد اس وقت جھلسا دینے والی دھوپ میں ننگے بدن، برہنہ پا پتھر توڑ رہے ہیں، کیا اس سے زیادہ دنیا میں کوئی بے عزتی، بے حیائی اور بے شرمی ہو سکتی ہے کہ جو افراد فاقہ کر کر کے اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر اس کے لئے یہ نعایم و لذائذ فراہم کریں اُنھیں کے دکھ درد کی طرف سے وہ یوں بے خبر و بے پروا رہے -

ہر چند فرعون و نمرود کو گزرے ہوئے زمانہ گزر گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی اولاد ابتک دُنیا میں باقی ہے اور اسی اخلاق سوز و انسانیت شکن خصوصیات کے ساتھ باقی ہے جو کسی وقت اُن کے اسلاف میں پائی جاتی تھیں مگر صرف یہ ہے کہ اُن پر عذاب نازل ہو چکا اور ان کے لئے ہنوز دست خدا میں انتظار کر رہا ہے -

علماء کے کسی مجمع میں ایک بار میں نے دریافت کیا کہ "فرمائیے اب کیا ارادہ ہے اور قومی فلاح و بہبود کے لئے کون سی مقامی تحریک آپ کے پیش نظر ہے" - ان میں سے ایک نے کہا "ہاں، عرصہ سے میرا خیال ہے کہ یہاں کے مسلم کلب کی حالت درست کی جائے اور انسائکلوپیڈیا کے قسم کی ایک کتاب اُردو میں لکھی جائے" میں نے کہا "قبلہ، اپنے جھونپڑے کو محل بنانے سے پہلے کیوں آپ اسکی آرایش و زینت کی فکر میں مبتلا ہیں، تمدن کی ترقی، جاہ و ثروت کے تنعم کے ساتھ یہ سب کچھ اپنے آپ ہو رہے گا، نہ جانے کتنے کلب قایم ہو جائیں گے، کتنی انسائیکلوپیڈیا بن جائیں گی - اس وقت تو سوال جزحیات کا ہے - بقائے زندگی کا ہے، تن پوشی اور دفع گرسنگی کا ہے - اس لئے طریقۂ زکوۃ کو منظم کیجئے - قومی بیت المال کی طرح ڈالئے، گھر گھر جاکر دیکھئے کہ کون کس حال میں مبتلا ہے اور سب سے پہلے اس زخم کا علاج کیجئے جس نے ساری قوم کو مفلوج بنا رکھا ہے" یہ سُن کر فرمانے لگے "کہ ہاں یہ تحریک بھی ضروری ہے اور انشاءاللہ الرحمٰن اس پر غور کریں گے" لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ جب مولوی کسی بات کو انشاءاللہ سے شروع کرتا ہے تو اس کا انجام کیا ہوا کرتا ہے -

یہ ہے حال ان تمام اداروں کا جنھیں ہم مدرسہ و خانقاہ کہتے ہیں اور جہاں سے یہ زہریلے افعی نکل نکل کر مسلم آبادی کو ڈس رہے ہیں اُن کے علاوہ بعض ادارے ایسے ہیں جو صرف تصنیف و تالیف کے لئے وقف ہیں اور جن کے مریدوں کو فخر ہے کہ وہ دنیا میں بڑا کام کر رہے ہیں، مسلمانوں کی عظیم الشان خدمت انجام دے رہے ہیں لیکن چونکہ اُن کی ذہنیتیں بھی اسی مسموم ماحول کی پیداوار ہیں اس لئے اُن کی جملہ تصانیف غیر ضروری اور غیر اہم بلکہ ایک حد تک مضرت رساں ثابت ہوتی ہیں، یہ بڑی بڑی کتابیں تاریخ و جغرافیہ کی لکھ رہے ہیں، لیکن ان کی حقیقت داستان پارینہ دُہرانے سے زیادہ کچھ نہیں یہ فلسفہ و مذہب پر موٹی موٹی تالیفات پیش کر رہے ہیں، لیکن بالکل اسی اندھے کی طرح جس کا سہارا ایک لکڑی کے سوا کچھ نہ ہو - اول تو اُن کو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ وقت اس قسم کی تصنیف و تالیف میں ضایع کرنے کا نہیں بلکہ دوڑ کر اپنے آپ کو طوفان میں ڈال دینے اور ڈوبتے ہوؤں کو باہر نکالنے کا ہے اور اگر یہ اُن کے بس کی بات نہیں ہے تو پھر کم از کم ایسے لٹریچر پیش کرنے کا ہے جو دوسروں میں یہ ولولہ پیدا کرے -

جس وقت کوئی قوم ترقی کرتی ہے تو علوم و فنون کا ذخیرہ وہ خود اپنے ساتھ لے آتی ہے اور ہر جگہ علمی ادارے قایم ہونے لگتے ہیں لیکن جب انحطاط ہوتا ہے تو یہ ادارے خود بخود ضعیف ہونے لگتے ہیں اور اُن کو کوئی قوت سنبھال نہیں سکتی - اس لئے جس رنگ کی

تصانیف ہمارے یہاں کے بڑے مصنفین پیش کر رہے ہیں وہ وقت کے لحاظ سے بالکل لغو و بے کار ہیں اور اُن سے ملک و قوم کا کوئی فایدہ نہیں پہونچ سکتا بلکہ مضرت کا اندیشہ ہے کیونکہ ان کا موضوع اور ان کے اُصول ترتیب وہی آزادی عقل و ضمیر کے چھیننے والے اور اندھی تقلید کو مضبوط کرنے والے ہیں جس نے مسلمانوں کو نکبت و ذلّت کی اس منزل تک پہونچا دیا ہے۔

پھر جب حالات یہ ہیں تو سوال صرف یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے اور اپنی بقا و تحفظ کے لئے کیا تدابیر عمل میں لانا چاہئے۔

غالبًا آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت کرۂ زمین پر مسلمانوں کی آبادی تقریبًا ۲۵ کروڑ ہے اور اسی کے ساتھ غالبًا یہ بھی آپ کے علم میں ہوگا کہ یہ آبادی کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہے، آپ نقشہ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف یہ سلسلہ مغربی افریقہ کے سواحل اٹلانٹک سے شروع ہو کر بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل کو اپنی آغوش میں لیتا ہوا مصر اور مغربی ایشیا تک پہونچتا ہے اور پھر سواحل بحرِ قلزم و بحرِ اسود سے ہوتا ہوا سائبیریا اور منگولیا تک پہونچ جاتا ہے، دوسری طرف مشرقی ساحلِ افریقہ سے شروع ہو کر مڈغاسکر کے عرض البلد پر منتہی ہوتا ہے اس کے بعد ایک سلسلہ وہ ہے جو افغانستان کے کوہستان کو عبور کر کے ہندوستان تک پہونچتا ہے اور یہاں سے جزیرۂ ملایا ہوتا ہوا مشرقی مجمع الجزائر تک پہونچ جاتا ہے۔

اچھا اب اسی کے ساتھ آپ تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کی یہ تدریجی ترقی نہ تھی بلکہ ایک سیلاب کی سی ترقی تھی جو وقتًا فوقتًا اُٹھتا رہا اور چند صدیوں میں کرۂ ارض کے اتنے وسیع حصہ پر محیط ہوگیا ۶۳۰ء اور سنہ ۷۵۰ء کے درمیان ہسپانیہ و مراکش سے لیکر وسط ایشیا تک پھیل گیا اور تقریبًا ڈھائی صدی تک اسی جگہ محدود رہا۔ اس کے تقریبًا ڈھائی صدی بعد سنہ ۱۰۰۰ء اور سنہ ۱۱۰۰ء کے درمیان اس کی وسعت مغربی افریقہ سے لیکر ایشیا کوچک، وسط ایشیا اور شمالی ہند تک پہونچ گئی۔ پھر دو صدی گزرنے کے بعد ایک اور لہر اُٹھی جس نے (سنہ ۱۳۰۰ء اور سنہ ۱۴۰۰ء کے درمیان) جزیرہ نمائے بلقان سے لیکر سائبیریا، ہندوستان اور مجمع الجزائر تک تمام حصہ کو اپنے اثر میں لے لیا۔

اس وقت میں اس امر سے بحث نہیں کروں گا کہ اس کی ترقی کے کیا اسباب تھے، یعنی کوئی خاص اخلاقی خوبی اسلام میں ایسی تھی جس کا اثر دنیا پر پڑا یا یہ کہ صرف اس کی عسکریت کو اس کا امتیاز دینا چاہئے بہر حال حقیقت یہ ہو یا وہ ہمیں اس سے بحث نہیں دیکھنا یہ ہے کہ اسلام جہاں جہاں گیا کن خصوصیات کے ساتھ گیا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا لیکن اس پر غور کرنے سے قبل بطور اصول موضوعہ ہم کو یہ متعین کر لینا چاہئے کہ اسلام سے ہماری مراد اس مضمون میں کیا ہے۔

میں اس سے قبل بھی ظاہر کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ دین و مذہب بالکل علٰحدہ چیزیں ہیں، یعنی دین نام ہے اس خاص اعتقاد کا جو متعلق ہے ہماری عبادات سے، ہماری مابعد الطبیعیات اور اس سکون نفس سے جو کسی مخصوص عقیدہ کی بنا پر انفرادی طور پر ایک شخص کو حاصل ہوتا ہے سوسائٹی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، لیکن مذہب نام ہے اس تہذیب و تمدن کا جو کسی دین کے تحت دُنیا میں قایم ہو جاتا ہے اور جس کا تعلق انسان کی ہیئت اجتماعی سے ہوتا ہے، اس کا میں وہی مفہوم قرار دیتا ہوں جو انگریزی لفظ (Culture) کا ہے پس میری مراد بھی مضمون زیر بحث میں مذہب سے ہے نہ کہ دین سے یعنی میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اسلام بہ لحاظ اعتقاد مذہبی نہیں بلکہ بہ حیثیت ایک خاص مذہب (Culture) ہونے کے کیا خصوصیات اپنے ساتھ ہر جگہ لے گیا۔

اب اس سلسلہ میں آپ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ جس وقت اسلام کا ظہور ہوا اس وقت اس کا ماحول کیا تھا، اس میں کلام نہیں کہ اسلام پیدا ہوا ایشیا ہی کے ایک گوشہ سے، لیکن اثر اس نے قبول کیا یورپ کی اس تہذیب کا جس کے لئے صحیح لفظ میرے خیال میں صرف "یونانیات" ہے مگر اس سے مراد ملک یونان کی تہذیب نہیں بلکہ وہ تمام مغربی تہذیب مقصود ہے جو حقیقتًا مجموعہ تھی روما و یونان دونوں کی تہذیب کا اور جس سے نہ صرف سارا یورپ بلکہ جزیرہ نمائے عرب بھی عرصہ تک ممتاز رہنے کے بعد اپنے دورِ انحطاط

میں اسی کے زیر اثر نظر آتا تھا چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ولادت نبوی و بعثت کے وقت سرزمینِ حجاز میں بھی یہود و نصاریٰ ہی کا اثر قایم تھا، اہلِ عرب باوجود اس کے کہ اُن کی بُت پرستی شدید قسم کی بت پرستی تھی نصاریٰ و یہود کے علماء کا خاص احترام کرتے تھے اُنکے علم و فضل اور روحانیت کے قایل تھے۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ بھی تھا کہ اہلِ عرب میں بُت پرستی کا خیال خود یونان و روما سے آیا تھا، لیکن اس کی بڑی وجہ سلطنتِ روما کے اقتدار و وسعت، ہیبت و جبروت کی وہ روایاتِ قدیمہ تھیں جو عرب میں ایک ایک بچّہ کے ذہن نشین ہو چکی تھیں اور قدرتاً ہونا چاہئے تھیں جبکہ اُسوقت بھی قسطنطین اعظم کا مسیحی جھنڈا آبنائے باسفورس پر لہراتا ہوا ہر شخص کو نظر آتا تھا۔

ہر چند اسلام نے اپنی فتوحات کا اولین ہدف یونان و روما ہی کی حکومت کو قرار دیا لیکن بجائے اس کے کہ یونانیات کا اثر زایل ہوتا مسلمانوں پر اور زیادہ رنگ اس کا چڑھ گیا۔ یعنی گو ظاہری حکومت تو اہلِ یوروپ کو ضرور چھین گئی لیکن اس کی تمدنی حکومت عربوں پر اور زیادہ قایم ہو گئی، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ عربوں نے نہ صرف علوم و فنون میں یونانی لٹریچر کا اثر قبول کیا بلکہ تدوین شرع و فقہ میں بھی ارسطو کی تصانیف سے مدد لی گئی حتیٰ کہ بعض مفسرین نے تو اسکندر اعظم کو پیغمبر تک قرار دیدیا، ایک ہی تہذیب کی مختلف قوموں کا ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے، ہمیشہ ہوا ہے اور ہوگا خود مسلمانوں میں باہم جس قدر جنگ و خونریزی ہوئی ہے کسی سے مخفی نہیں، الغرض مسلمانوں کا روما و یونان کے مقبوضات کو تصرف میں لے آنا اگر ایک طرف اسلام کی فتح تھی، تو دوسری طرف یونانیات کی بھی کامیابی تھی جس سے اسلام برابر متاثر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور اگر ایرانی تہذیب جو جزیرہ نمائے عرب میں کہیں کہیں اکاسرۂ عجم کے سطوت و اقتدار کو قایم کئے ہوئے تھی اس وقت نہ پائی جاتی جس سے اہلِ عرب ایک حد تک متاثر ہو چکے تھے، تو آج مسلمانوں کی تہذیب یکسر مغربی تہذیب ہوتی اور اس میں ادنیٰ شائبہ بھی مشرقیت کا نہ پایا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دور ترقی میں علوم و فنون کی بڑی خدمت انجام دی لیکن اس کی بنیاد بھی وہی یونانیات تھی جنھے کسی وقت اسلام کا ساتھ نہیں چھوڑا اور آخر کار ان کے تمام شعبہ ہائے حیات کو اس قدر سختی کے ساتھ جکڑ لیا کہ آج ہندوستان میں بھی جہاں مسلمانوں کو رہتے ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں، وہی مغربی خصوصیت اُن کی قایم ہے اور جس نے اُن کے مستقبل کو مشرق میں حد درجہ تاریک بنا رکھا ہے۔

آپ اسلامی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمان جہاں گئے اپنی تہذیب اپنے ساتھ لے گئے اور کسی مفتوحہ ملک کے تمدن سے متاثر نہیں ہوئے جو بالکل مغربی ذہنیت ہے —— ہندوستان میں ایک غضب اور یہ ہوا کہ دورِ مغلیہ ختم ہونے کے بعد انگریزوں کی حکومت شروع ہو گئی جو ایک مغربی قوم تھی اور اپنی تمام مغربی خصوصیات اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس لئے جسوقت جذبات عناد و انتقام مسلمانوں کے سرد پڑ گئے تو پھر وہی اُن کی تقلید میں پیش پیش نظر آنے لگے اور اپنے اوپر افرنجیت طاری کرنے میں نمایاں سبقت کا اظہار کیا —— آپ کسی مسلمان سے جس نے کچھ کچھ بھی مذہبی تعلیم حاصل کی ہے دریافت کیجئے کہ وہ انگریزوں اور ہندوؤں میں سے کس کو بہتر سمجھتا ہے تو وہ فوراً انگریزوں کا نام لے دے گا اور یہ دلیل بیان کرے گا کہ وہ صاحبِ کتاب ہیں اور یہ کافر، ان کی لڑکیوں سے ہم شادی کر سکتے ہیں اور انکے یہاں نہیں، کلام پاک ان کے ساتھ صلح و آشتی سے رہنے کی ہدایت کرتا ہے اور مشرکین و کفار سے نہیں۔ الغرض وہ بہت سے اسباب و دلایل نصاریٰ کی ترجیح میں پیش کر دے گا، لیکن عمرانیات و اقتصادیات یا اجتماعی و سیاسی مصالح کا کوئی سوال اس کے سامنے نہ ہوگا۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اگر ان مسلم حکومتوں کی ذہنیت جو مغرب سے قریب ہیں انھیں مغربی تہذیب کی طرف کھینچ رہی ہے تو درست ہے اور وہ انھیں اصول کو سامنے رکھ کر ترقی کر سکتے ہیں لیکن پاکستان اگر ان کی پیروی کرنا چاہے تو یہ کیونکر کامیاب ہو سکتا ہے، جبکہ اس کا قریب ترین تعلق ہندوستان سے ہے اور اگر ان دونوں ملکوں میں کوئی اختلاف بھی ہے تو وہ ایسا نہیں جو ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے نہ دے۔ لیکن پاکستان کے مسلمان میں یہ ذہنیت اس وقت تک پیدا ہونا دشوار ہے جب تک وہ کتاب و سنّت پر اپنے آئین کی بنیاد رکھنے کا خواب دیکھ رہا ہے، کیونکہ "کتاب و سنت" کا نام آتے ہی مولوی دستور پر اپنا اقتدار قایم کرلے گا اور مولوی کا جو نظریہ کتاب و سنّت کے متعلق ہے، اس کی فرسودگی و کہنگی ظاہر ہے۔

ہندوستان کی آبادی

(۱۹۵۱ء)

ہندوستان کی کل آبادی جس میں تمام مذاہب شامل ہیں ۳۴ کروڑ ۲۲ لاکھ ۳۸ ہزار چھ سو بیس ہے۔
مذاہب کے لحاظ سے آبادی کی ترتیب یہ ہے:-

ہندوؤں کی آبادی	=	۲۸۸۸۶۸۵۳۳
مسلم آبادی	=	۳۵۱۰۹۷۷۹
عیسائی آبادی	=	۸۱۷۳۱۳۱
سکھ آبادی	=	۶۲۱۵۹۸۰
وحشی اقوام و مذاہب	=	۱۹۷۳۹۱۷
جینی	=	۱۶۱۹۱۵۶
بودھ	=	۱۳۸۸۴۹
زردشتی	=	۱۱۱۶۱۰
یہود	=	۲۶۶۶۹

صوبہ وار آبادی کا نقشہ یہ ہے:-

صوبہ	ہندو	سکھ	جین	بدھ	زردشتی	مسلمان	عیسائی	یہود	دیگر مذاہب و اقوام	میزان
یوپی	۵۳۷۶۲۹۲۵	۱۹۷۶۱۲	۹۷۷۴۴	۳۲۲۱	۱۲۵۸	۹۰۲۸۹۹۲	۱۲۳۸۷۶	۳۴	۸۰	۶۳۲۱۵۷۴۲
بہار	۳۳۳۱۶۴۱۴	۳۸۶۲۳	۸۶۵۶	۱۱۲۸	۴۵۵	۴۵۶۴۴۶۶	۴۲۲۰۳۰	۹۲	۸۸۳۹۶۱	۱۴۳۱۸۹۴۷
مغربی بنگال مع چندر نگر	۱۹۵۱۰۶۶۰	۲۹۸۶۷	۱۹۱۱۶	۸۱۵۸۹	۱۹۱۸	۴۹۲۷۱۶۳	۱۷۵۲۹۳	۲۶۱۹	۱۱۱۹۹۲	۲۴۸۶۰۲۱۷
آسام	۵۸۹۴۷۳۳	۴۱۰۷	۴۲۴۵	۲۲۶۷۵	۲۷	۱۹۹۶۴۵۶	۵۸۵۳۹۹	۲۰۹	۵۳۵۸۵۶	۹۰۴۳۷۰۷
مدراس	۴۹۹۹۵۳۱۸	۲۸۵۹	۳۵۷۷۸	۱۳۷۵	۲۰۸۷	۴۵۳۸۱۳۶	۲۴۳۱۰۰۶	۴۷۴	۸۹۶۹	۵۷۰۱۶۰۰۲
بمبئی	۳۱۷۸۵۶۱۴	۲۸۰۱۷	۵۷۲۰۹۳	۲۳۹۵	۹۷۵۷۳	۲۹۰۶۸۸۷	۵۲۵۴۵۴	۲۰۱۳۵	۸۹۸۲	۲۱۲۴۷۵۳۳
مدھیہ پردیش	۲۰۲۱۵۶۰۷	۳۳۳۹۶	۹۶۲۵۱	۲۸۴۱	۳۰۶۶	۸۰۰۷۸۱	۸۸۸۰۲	۲۲۸	۶۶۶۱	۲۱۲۴۷۵۳۳
پنجاب	۸۱۷۴۴۳۰	۳۸۳۱۹۸۳	۳۷۵۱۸	۱۴۴۱	۷۷	۲۲۹۰۸۰	۹۵۲۹۳	۱۵۰	۴۳۱ (۲۶۸۶۰۲) جنکا ریکارڈ جل گیا	۱۲۶۴۱۲۰۵
میسور	۸۱۷۷۲۹۱	۳۲۴۷	۲۲۹۳۶	۱۱۲۵	۴۷۰	۶۹۸۸۳۱	۱۷۰۹۰۹	۱۸۲	۱	۹۰۷۴۹۷۲
ٹراونکور کوچین	۵۵۸۷۸۵۲	۲۷۵	۳۵۴	۴۰	۳۸	۷۲۱۲۲۷	۲۹۶۱۰۳۰	۲۲۲۸	۳۲۱	۹۲۸۰۴۲۵

صوبہ	ہندو	سکھ	جین	بدھ	زردشتی	مسلمان	عیسائی	یہود	دیگر مذاہب و اقوام	میزان
سوراشٹرا	۳۵۸۷۸۸۴	۸۸۱	۱۲۳۹۱۶	۱۳	۵۶۰	۴۲۲۱۸۶	۱۷۱۴	۶۹	۳۶	۴۱۳۷۳۵۹
مدھ بھارت	۷۳۳۳۰۲۱	۱۲۵۲۱	۱۰۰۲۳۴	۲۱۹	۹۳۴	۴۹۶۱۵۳	۱۰۹۴۷	۱۲۵	—	۷۹۵۴۱۵۴
حیدرآباد	۱۶۰۸۸۹۰۵	۸۴۴۹	۳۰۲۸۷	۱۴۵	۱۹۹۲	۲۲۰۶۱۸۲	۲۹۰۹۴۳	۱۶	۲۸۱۵۹	۱۸۶۵۵۱۰۸
راجستھان	۱۳۸۶۲۱۵۰	۱۴۴۲۳۴	۳۲۷۸۶۳	۴۱	۵۰۰	۹۴۹۳۴۸	۶۷۹۲	—	—	۱۵۲۹۰۷۹۷
پیپسو	۱۷۰۴۳۴۹	۱۷۲۱۹۳۸	۷۵۵۸	۲۱۹	۹۸	۵۵۹۱۳	۳۵۶۵	۹	۱۹	۳۴۹۳۶۸۵
دہلی	۱۴۶۷۸۵۴	۱۳۷۰۹۶	۲۰۱۷۴	۵۰۳	۱۶۴	۹۹۵۰۱	۱۸۶۸۵	۹۰	۵	۱۷۴۴۰۷۲
اجمیر	۵۹۹۵۲۴	۳۹۶۴	۳۲۰۰۴	۴۳۱۹	۲۶۲	۴۸۸۸۶	۴۴۱۳	—	—	۶۹۳۳۷۲
منی پور	۳۴۷۳۲۵	۵۰	۱۵۰	۳۳	۱	۳۷۱۹۷	۶۸۳۹۴	—	۱۲۴۴۸۵	۵۷۷۶۳۵
تریپورا	۴۸۰۶۶۲	۳۵	۳۶	۱۵۴۰۳	۱	۱۳۶۹۴۰	۵۲۶۲	—	۶۹۰	۶۳۹۰۲۹
کورگ	۱۹۹۴۶۵	۹	۵۴	۱۶	۱۰	۲۳۰۶۲	۶۷۸۸	—	۱	۲۲۹۴۰۵
کچھ	۳۹۳۱۲۸	۴۷۸	۶۲۳۹۷	—	۴۹	۱۱۱۴۳۴	۱۱۷	۳	—	۵۶۸۶۰۶
وندھیا پردیش	۳۴۸۵۰۸۳	۵۲۹	۱۱۸۳۵	۷	۱۳	۷۶۱۲۶	۱۰۹۲	۵	—	۳۵۷۴۶۹۰
بھوپال	۷۰۰۳۸۱	۵۶۲	۵۹۸۵	۷	۵۵	۱۲۸۶۷۲	۸۱۲	—	—	۸۳۶۴۷۴
ہماچل پردیش	۱۰۸۸۸۴۱	۵۰۱۹	۳۴	۲	۶	۱۵۲۵۳	۳۱۷	×	×	۱۱۰۹۴۷۲
جزائر انڈمان و نکوبار	۹۳۹۴	۱۲۶	۱	۱۶۰۴	۲	۴۷۸۳	۹۳۹۴	۱	۵۶۶۶	۳۰۹۷۱
سکم	۹۷۸۶۳	۱۸	۱۹	۳۹۳۹۷	—	۱۲۴	۳۰۴	×	×	۱۳۷۷۲۵
میزان:۔	۲۸۸۸۸۶۸۵۲۳	۶۲۱۵۹۸۰	۱۶۱۹۱۵۶	۱۳۸۸۴۹	۱۱۱۶۱۰	۳۵۱۰۹۷۷۹	۸۱۷۳۱۳۱	۲۶۶۶۹	۱۹۷۴۹۱۷	میزان کل ~~۳۸۸۸۶۸۵۲۳~~

اس میں مسلم آبادی تین کرور ۱۵ لاکھ نو ہزار سات سو اناسی ہے جو مختلف صوبوں میں اس ترتیب سے پائی جاتی ہے:۔

یوپی :۔ ۹۰۲۸۹۹۲
مغربی بنگال :۔ ۴۹۲۷۱۶۳
بہار :۔ ۴۵۲۴۴۶۶
مدراس :۔ ۴۵۳۸۱۲۶
بمبئی :۔ ۲۹۰۲۸۸۷
حیدرآباد :۔ ۲۲۰۶۱۸۲
آسام :۔ ۱۹۹۲۴۵۶
راجستھان :۔ ۹۴۹۳۴۸
مدھ پردیش :۔ ۸۰۰۷۸۱

ٹراونکور کوچین :۔ ۷۲۱۲۲۷
میسور :۔ ۶۹۸۸۳۱
مدھ بھارت :۔ ۴۹۶۱۵۳
سوراشٹرا :۔ ۴۲۲۱۸۶
تریپورہ :۔ ۱۳۶۹۴۰
پنجاب :۔ ۲۲۹۰۸
بھوپال :۔ ۱۲۸۶۷۲
کچھ :۔ ۱۱۱۴۳۴
دہلی :۔ ۹۹۵۰۱

میزان کل
۳۵۱۹۷۷۹

وندھیا پردیش :۔ ۷۶۱۱۹
پیپسو :۔ ۵۵۹۱۳
اجمیر :۔ ۴۸۸۸۶
منی پور :۔ ۳۷۱۹۷
کورگ :۔ ۲۳۰۶۲
ہماچل پردیش :۔ ۱۵۲۵۳
جزائر انڈمان و نکوبار :۔ ۴۷۸۳
سکم :۔ ۱۲۴

مومن کا تغزل

مومن اُردو کے ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جن کے ممتاز غزل گو ہونے پر تذکرہ نگاروں سے لے کر اس دور کے نقادوں تک کے درمیان دو رائیں نہیں ہیں۔ مومن کو غالب اور شیفتہ جیسے معاصرین نے بھی خراج تحسین ادا کیا تھا اور آج کے بھی اکثر اہل نظر ان کے بڑے مداح ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر مومن کے کلام کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت عقیدت مندانہ مبالغہ آرائی اور طرفداری سے کام نہ لیا جائے جب بھی ان کو اُردو کے بڑے غزل گو شاعروں کی فہرست میں رکھنا ہی ہوگا۔ لیکن میں مومن کے تغزل کا قایل ہونے کے باوجود ان کے نقادوں سے اکثر مقامات پر متفق نہیں ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مومن کے کلام کا جو حصہ ہمیشہ پر کیف و شاداب رہنے والا ہے اس کی طرف اب تک یا تو سرے سے توجہ نہیں کی گئی یا نگاہ غلط انداز کو کافی سمجھا گیا۔ اور جو اشعار وقت کے ہاتھوں اپنی آب و تاب کھو چکے اور کھو رہے ہیں ان کو مومن کا سرمایۂ کمال قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ صرف ذوق و وجدان کے اختلاف کا نتیجہ ہے کہ مومن کے جو اشعار میرے نزدیک سدا بہار ہیں ان کی طرف دوسرے نقاد ملتفت نہ ہو سکے یا ان کو اتنا وقیع نہ سمجھ سکے جتنا کہ میں سمجھ رہا ہوں —— لیکن اگر تنقید صرف ذوق و وجدان کے فیصلے کا نام نہیں بلکہ اس میں غور و فکر اور تحلیل و تجزیہ کے نتائج بھی اہمیت رکھتے ہیں تو نامناسب نہ ہوگا اگر میں مومن پر اظہار خیال کے سلسلے میں ان کے نقادوں سے اپنے اختلافات کا بھی ذکر کردوں۔

کلام مومن کی جو خصوصیت بڑے فخر کے ساتھ پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مومن نے غزل کو عشق و محبت کے جذبات و معاملات تک محدود رکھا اور اس طرح تغزل کی حدوں سے متجاوز نہ ہوئے۔ بحث و تمحیص کے لئے اس مسئلہ میں بڑی جان ہے کہ عشق و محبت کے علاوہ دوسرے مضامین کو غزل کا موضوع بنانا مستحسن ہے یا نہیں۔ لیکن مجھے اس مسئلہ سے کوئی سروکار نہیں۔ یہاں دیکھنا صرف یہ ہے کہ مومن کے متعلق پروفیسر ضیا احمد بدایونی کا یہ دعوے کہ انھوں نے "غزل کو اس کے حقیقی مفہوم میں منحصر کردیا" یا عجز سہسوانی کا یہ قول کہ انھوں نے "جو کچھ کہا تغزل کے اندر ہی کہا" اور "عشق و محبت کے جذبات سے تمام دیوان کو مملو کردیا" کس حد تک صحیح ہے۔ اس امر کے جانچنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ تغزل کی حدوں سے انحراف کی کتنی صورتیں ممکن ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہی ہے کہ غزل میں تصوف، اخلاق اور فلسفہ وغیرہ کے مضامین بیان کئے جائیں۔ جب مومن کے پرستار یا نقاد یہ کہتے ہیں کہ مومن نے غزل کو تمام بیگانہ اور اجنبی مضامین سے محفوظ رکھا تو ان کا مطلب صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ مومن کا کلام تصوف کے مضامین سے خالی ہے چنانچہ نیاز فتحپوری ایک جگہ لکھتے ہیں:۔ "دوسری خصوصیت جو مومن کو اپنے دیگر ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ رنگ تغزل میں ان کا کلام اس غیر متغزلانہ چیز سے پاک ہے جس کو تصوف یا عشق حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہے" اور اس میں شک نہیں کہ مومن نے تصوف اور فلسفہ کے مسایل کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن تغزل کی حدوں سے متجاوز ہونے کی جو دوسری صورت ہوسکتی ہے اسکی طرف مومن کے پرستاروں اور نقادوں کی نگاہ نہیں جاتی درانحالیکہ وہ چیز مومن کے یہاں موجود ہے آپ بیتابی سے پوچھیں گے وہ کیا؟۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غزل میں ایسے مضامین ادا کئے جائیں، جو بظاہر حسن و محبت سے متعلق تو ضرور ہوں لیکن اگر ان پر غور کیا جائے تو وہ نہ صرف جذبات و محسوسات اور واردات و معاملات سے عاری ثابت ہوں بلکہ مفہوم و معنی سے بھی بیگانہ نکلیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خدا کرے ملک الموت ان سے پہلے آئے بہت سی لینی ہیں جانیں پئے نثار مجھے

اس شعر میں ایک ایسے عاشقِ ہجراں نصیب کا ذکر ہے جو اپنی محبوبہ کی آمد کا منتظر ہے مگر اس کی آرزو یہ ہے کہ محبوبہ کے آنے بیشتر ملک الموت اس کے پاس روحوں کا پشتارہ لئے ہوئے آجائے تاکہ محبوبہ پر نچھاور کرنے کے لئے بہت سی جانیں مستعار لی جا سکیں اب ذرا سوچئے کہ کیا عاشقوں کے دماغ میں اسی قسم کے لایعنی خیالات پرورش پاتے رہتے ہیں کیا عشق و محبت میں دیوانگی کا مفہوم یہی ہے کہ عاشق ذہنی مجہولیت اور لغویت کی اس سطح پر اتر آئے؟ فرض کئے لیتا ہوں کہ جنونِ محبت کے زیر اثر انسان اس قسم کی باتیں بھی کرسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب ایک طرف متصوفانہ مسایل و نکات کو غزل کے لئے اجنبی اور بیگانہ مضامین قرار دیا جاسکتا ہے تو دوسری طرف کسی مخبوط الحواس عاشق کی ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی کو غزل میں کیونکر روا رکھا جاسکتا ہے:-

گر پھر بھی اشک آئیں تو جانوں کہ عشق ہے حقّے کا منہ سے غیر کی جانب دھواں نہ چھوڑ

بزم ناز کا کیا عجیب و غریب منظر پیش کیا گیا ہے۔ محبوب کے پاس عاشق اور رقیب دونوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ محبوب جس کی خصوصیات جمیل میں حقّہ نوشی بھی ہے حقّے کا کش لے لے کر رقیب کے منہ پر دھواں چھوڑتا جاتا ہے۔ دھواں کے اثر سے رقیب آنکھوں میں آنسو نکل آتے ہیں۔ محبوب اس قدر سادہ لوح یعنی عقل و فہم سے بے بہرہ واقع ہوا ہے کہ رقیب کے ان آنسوؤں پر اسے محبت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ حضرت عاشق محبوب کے اس گمان کو غلط ثابت کرنے کے لئے اس سے کہتے ہیں کہ تم رقیب کے منہ پر حقّے کا دھواں نہ چھوڑو۔ اگر اس کے بعد بھی اس کی آنکھوں میں آنسو نکل آئیں تو میں سمجھوں کہ اس کو واقعی تم سے محبت ہے۔ کیا بزم ناز کی یہ مضحکہ خیز تصویر جو شاعر کی خوش مذاقی، سلامت طبع اور لطافتِ ذوق کی دلیل ہے تغزل کے تحت آسکتی ہے؟ کیا تغزل اور تمسخر ایک ہی چیز کے دو نام ہیں؟

ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ تنقید میں کسی شاعر کے گھٹیا اشعار کو سامنے رکھ کر گفتگو کرنا مناسب نہیں۔ لہٰذا اب میں مومن کے دو ایک ایسے شعر پیش کرتا ہوں جن کی تعریف میں ایک اہلِ نظر رطب اللسان ہیں ؎

غیر عیادت سے بُرا مانتے ہیں قتل کیا آن کے اچھا کیا

اثر لکھنوی اپنے مضمون میں اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں:- "دیکھئے ان سادہ الفاظ کے انداز بیان نے کس قدر معنی پیدا کئے ہیں۔ معشوق در اصل عاشقِ زار کو قتل کرنے آیا تھا جو انتہائے بیرحمی ہے گو معشوق کی شان یہی ہے۔ مگر ہائے عشق جو معشوق کے آنے کو عیادت پر محمول کرتا ہے اور قتل کو حیائے معشوق کا پردہ بتاتا ہے۔ اس کے ساتھ اظہار رشک کرتا ہے جو جان عاشقی ہے۔ کہتا ہے کہ در اصل میری عیادت کو آیا تھا مگر اسی کے ساتھ تجھے غیروں کا بھی پاس تھا اور اسی لئے کہ وہ برا نہ مانیں ان کے سمجھانے کو تونے مجھے قتل کر ڈالا تاکہ اب وہ عیادت کا شکوہ نہ کرسکیں۔ بلکہ یہ سمجھیں کہ تو میری عیادت کو نہیں گیا بلکہ قتل کرنا مقصود تھا۔

قافیہ "اچھا" سے ایک اور نازک مطلب پیدا ہوتا ہے۔ میں قتل ہوا اچھا ہوا۔ اب رقیبانِ بوالہوس اگر بیمار ہونگے تو اپنی جان کے ڈر سے تجھ سے عیادت کے متمنی نہ ہوں گے بلکہ اسی دھڑکے میں مرجائیں گے کہ تو کہیں عیادت کے بہانے سے آکر مار نہ ڈالے"

ایک اور مثال لیجئے:-

بہ جوشِ یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت دُعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا

اثر لکھنوی لکھتے ہیں:- "جذبۂ یاس کی تصویر کس خوبی سے کھینچی ہے۔ وصل سے مایوس ہوکر اپنے مرنے کی دعا مانگی جو اس طرح قبول ہوئی کہ معشوق قتل پر آمادہ ہوگیا جس کا لازمی نتیجہ قربِ قاتل و مقتول ہے۔ اب وصل کوئی مشکل نہ تھا۔ مگر جوشِ یاس

نے دعائے وصل سے باز رکھا ورنہ دعائے مرگ کی طرح وہ بھی مستجاب ہوتی"۔

مندرجۂ بالا دو مثالوں کے متعلق میں اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا۔ اس محل پہ نیاز فتحپوری اور پروفیسر ضیاء احمد کے مضامین سے دو اقتباسات پیش کردینا کافی سمجھتا ہوں تاکہ ان کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کرلیں کہ متذکرہ اشعار تغزل کے منافی ہیں یا نہیں۔ پروفیسر ضیاء لکھتے ہیں:۔" ہمارے خیال میں ایک غزل نگار کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ غزل کی بنیاد صرف ان واردات پر رکھے جن کا تعلق جذبات عشق و محبت سے ہے"۔ نیاز صاحب لکھتے ہیں:۔" تصوف کے حدود وہاں سے شروع ہوتے ہیں جہاں عقل کی پرواز ختم ہوجاتی ہے۔ اور وہ فضا جو ماورائے سرحدِ عقل و شعور ہے اس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں یہاں تک کہ مجانین و مجاذیب کی باتیں بھی وہاں کوئی نہ کوئی مفہوم اختیار کرلیتی ہیں اس لئے میرے نزدیک تغزل میں تصوف کو شامل کرلینا ایک غزلگو شاعر کا کمال نہیں بلکہ اس کا عجز ہے"۔

اب آپ دو باتوں پر غور فرمائیں اول تو یہ کہ مندرجۂ بالا شعروں میں مومن نے غزل نگار کا فرض کس حد تک ادا کیا۔ دوسرے یہ کہ اگر غزل میں تصوف سے تعلق رکھنے والے مجانین و مجاذیب کی بے معنی باتوں کا بیان غیر مستحسن اور غزل گو شاعر کا عجز ہے تو پھر کسی عاشق کے بھی لایعنی خیالات کو تغزل کے منافی کیوں نہ قرار دیا جائے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ ان حضرات کی توجہ کا خاص طور پر مستحق ہے جن کا یہ خیال ہے کہ مومن نے غزل کو اس کے حقیقی مفہوم میں منحصر کردیا۔

میں نے اوپر کی سطروں میں مثال کے طور پر صرف چار شعر پیش کئے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مومن کے دیوان میں مجھے مثال کے لئے صرف چار ہی شعر مل سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار سے دیوان مومن کا ایک بھی صفحہ خالی نہیں۔

مومن کے تغزل سے متعلق پروفیسر ضیاء کے دو ایک اور بیانات خصوصیت کے ساتھ محل نظر ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

" اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ مومن دنیا کو اپنی نسبت مغالطے میں رکھنا نہیں چاہتے کہ عشق کے جذبے سے ناآشنا ہوں اور بہ "ضرورت شعر" خود کو عاشق ظاہر کریں۔ یا عشق مجازی کی منزل میں ہوں اور متصوف بنیں" یہ صحیح ہے کہ مومن عشق کے جذبے سے ناآشنا نہیں تھے۔ اس میں بھی کلام نہیں کہ انھوں نے نہ تو "حقیقت" کو "مجاز" کے پردے میں چھپایا اور نہ "مجاز" کو حقیقت تک پہونچنے کا بہانہ بنایا لیکن باایں ہمہ یہ واقعہ ہے کہ ان کے کلام کا کثیر حصہ "بہ ضرورت شعر" کہا گیا ہے نہ کہ اپنے تجربات و محسوسات کے اظہار کی غرض سے۔ چنانچہ ان اشعار کے آئینے میں جس عاشق کا عکس نظر آتا ہے وہ ان تمام خصوصیات کا مالک ہے اور اُردو شاعری کے روایتی عاشق سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ اُردو غزل کی سب سے بڑی بدنصیبی یہی تو رہی ہے کہ ہمارے شعرا نے عشق میں بہکنے کی جرأت کی ہو یا نہیں لیکن وہ عشقیہ شاعری میں بہکی بہکی باتیں ضرور کرتے ہیں۔ انھوں نے محبت میں جو کچھ نہیں کیا اور نہ کیا جاسکتا ہے اس کے بیان میں سیکڑوں اشعار کہہ ڈالتے ہیں اور فی الواقع جو کچھ ان پر گزرتی ہے اُسے اپنی شاعری میں بہت کم جگہ دیتے ہیں۔

پروفیسر ضیاء ایک جگہ لکھتے ہیں:۔" مومن کی شاعری اکثر اساتذۂ دہلی کی طرح تقریباً تمام تر داخلی ہے۔ لکھنؤ کے شعرا خارجی متعلقات حسن و عشق پر زیادہ زور دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا کلام پھیکا اور بے اثر ہوکر رہ گیا۔ اس کے برخلاف مومن کے یہاں مضامین وصل۔ ہجر۔ رشک۔ رندی۔ جنون۔ زار نالی سب میں داخلی انداز نمایاں ہے"۔

جب کوئی شعر کسی جذبہ یا احساس پر مبنی ہوگا تو خواہ اس کا موضوع دنیا کی کوئی چیز ہو اس میں داخلی انداز یقیناً نمایاں ہوگا لیکن جب کسی شعر کی بنیاد تخیل کے ہوائی قلعوں پر ہوگی وہاں داخلیت کیا معنی، ڈھب کی خارجیت تک پیدا نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ مومن کے کلام کا نصف سے زاید حصہ ایسا ہے کہ داخلیت اور خارجیت کے اعتبار سے اس پر کوئی حکم لگایا ہی نہیں جاسکتا۔ لہٰذا پروفیسر ضیاء کا یہ خیال کہ مومن کی شاعری اکثر اساتذۂ دہلی کی طرح تقریباً تمام تر داخلی ہے، خوش عقیدگی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا

مومن نے ہر چند کہ خارجی متعلقات حسن و عشق پر لکھنوی شعرا کی طرح زیادہ زور نہیں دیا پھر بھی ان کے کلام کے بیشتر حصے میں پھیکا پن اور تاثیر کی کمی ضرور ہے۔

موصوف نے اپنے مندرجۂ بالا دعویٰ کے اثبات میں چند شعر پیش کئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے:-

شبِ ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے ، زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

باوجود انتہائی غور و فکر کے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ شعر داخلیت کی مثال کے طور پر کیوں پیش کیا گیا۔ اگر اس شعر کے معنی یہی ہیں کہ شب فراق میں عاشق پر بلاؤں کا نزول ہوتا رہا اور ہر بلا کو خوش آمدید کہتے کہتے اس کی زبان تھک گئی تو ذرا سوچئے کہ یہ بات کیا ہوئی۔ آخر وہ کون سی حسین بلائیں تھیں جو یکے بعد دیگرے عاشق کو پیش آتی گئیں اور وہ بڑی کشادہ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرتا گیا۔ واقعات کی دنیا میں ہر عاشق شب فراق کی جانگداز اذیتوں سے پناہ مانگتا ہے۔ مگر یہ شعر جس عاشق کے حال کی ترجمانی کے لئے کہا گیا ہے کہ اس کی بلند حوصلگی اور ضبط و تحمل کا کیا کہنا۔ واقعی سوز و گداز اور درد و اثر سے لبریز داخلیت کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے؟

جس طرح پروفیسر ضیاؔ اس بات کے دعویدار ہیں کہ مومن کی شاعری تمام تر داخلی ہے اسی طرح پروفیسر وقار عظیم کا دعویٰ ہے کہ "مومن اُردو کے تنہا غزل گو شاعر ہیں جن کے رنگِ تغزل میں ہر جگہ خلوص اور سچائی ہے" اس جملہ کو پڑھ کر مجھے بے اختیار غالبؔ کا یہ شعر یاد آگیا تھا ؎

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

لیکن اب جبکہ مومن پر مضمون لکھ رہا ہوں مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ وقار عظیم صاحب کے اس جملہ پر قلم کو انگشت بدنداں اور ناطقہ کو سر بگریباں چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤں۔ قبل اس کے کہ وقار عظیم صاحب کی اس رائے عالیہ کے متعلق کچھ عرض کروں آپ ان کی چند سطریں اور ملاحظہ فرمالیں جن میں موصوف نے متذکرہ دعوے کی وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"یہ کہتے وقت کہ مومن اردو کے تنہا غزل گو شاعر ہیں جن کے رنگِ تغزل میں ہر جگہ خلوص اور سچائی ہے میرے ذہن میں تغزل کا وہی مفہوم ہے جو عاشق محبوب اور رقیب کے مثلث میں گھرا ہوا ہے۔ غزلوں میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے لیکن میں اسے تغزل نہیں کہتا اور اسی لئے یہ دعویٰ کرتے وقت میری نظر میں میرؔ، غالبؔ اور آتشؔ کی عظمت مومن کی غزلوں سے زیادہ ہے جس چیز کا نام تغزل ہے اس کی کمی میرؔ، غالبؔ اور آتشؔ کے یہاں بھی نہیں، بلکہ جیسا کہ میں نے ابھی کہا یہ تغزل اکثر صورتوں میں محض رسمی اور روایتی ہے۔ میرؔ، غالبؔ اور آتشؔ اپنی شاعرانہ پیمبری کے باوجود تغزل کو اکثر ان کی رسمی اور روایتی قیدوں سے باہر نہ نکال سکے۔ یہ کام سب سے پہلے مومن نے کیا اور اس طرح کیا کہ یہ ان کا رنگ خاص بن گیا۔ اس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ مومن کی غزلوں میں عشق کی داستان گل اور بلبل، شمع اور پروانے، ساقی اور بادہ کی زبان سے بیان نہیں کی گئی۔ ان کی رشک پسند طبیعت کو گوارا نہ تھا کہ اپنے عشق کی کہانی ان پیامیوں کی زبانی دوسروں تک پہونچائیں اور اس لئے چند گنے چنے شعروں کو چھوڑ کر جن میں یہ اشارے برائے نام موجود ہیں (ان کے اچھے شعروں میں یہ بات نہیں) مومن کی غزلیں ان روایتی اشاروں سے بالکل پاک ہیں۔"

اس اقتباس کا غور سے مطالعہ کرنے پر دو نتیجے نکلتے ہیں۔ اول تو یہ کہ اگرچہ وقار عظیم صاحب نے دعویٰ تو یہ کیا ہے کہ مومن کے رنگ تغزل میں ہر جگہ خلوص اور سچائی ہے لیکن "ہر جگہ" سے ان کی مراد مومن کا پورا کلام نہیں بلکہ صرف اچھے اشعار ہیں۔ دوسرے یہ کہ "خلوص اور سچائی" سے ان کا مطلب یہ ہے کہ مومن نے اپنی غزلوں (بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اپنے اچھے اشعار) کو گل و بلبل شمع و پروانہ، اور بادہ و ساقی جیسے روایتی اشاروں سے پاک رکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر کسی شاعر کے اچھے اشعار میں بھی

خلوص اور صداقت کے عناصر نہ ہوں گے تو اور کہاں ہوں گے۔

دوسرے یہ کہ اگر کوئی شاعر غزل کے چند روایتی علامات و استعارات کو بر سر کار نہ لائے تو اس سے یہ کیونکر لازم آتا ہے کہ اُس کی شاعری سرتا سر خلوص اور صداقت پر مبنی ہے۔ خلوص اور صداقت کا اتنا محدود بلکہ غلط تصور شاید ہی دنیائے ادب میں اب تک کسی نے پیش کیا ہو۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ چند رسمی و روایتی اشاروں سے دامن چھڑا لینے کے باوجود ایک شاعر کے کلام کا بیشتر حصہ خلوص اور صداقت سے خالی رہ جائے۔ اس خیال کی تصدیق کے لئے خود مومن کے دیوان کا دیانتداری کے ساتھ مطالعہ کر لیجئے۔ پھر یہ بھی ناممکن نہیں کہ رسمی علامات و استعارات سے کام لینے کے باوجود خلوص اور صداقت کا سر رشتہ شاعر کے ہاتھ میں رہ گیا ہو۔ ثبوت کے لئے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر — جگنو ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر (ذوقؔ)

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے (ثاقبؔ)

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو — وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے (غالبؔ)

تھا آفتِ جاں اس کا اندازِ کمانداری — ہم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا (حالیؔ)

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت (حالیؔ)

خوفِ طوالت زیادہ مثالیں دینے میں مانع ہے۔ ان میں سے ایک بھی شعر ایسا نہیں جو روایتی اشاروں سے پاک ہو۔ پھر بھی ان اشعار کے خلوص اور صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہی نہیں کہ آپ ان میں سے کوئی بھی شعر کسی صاحب ذوق کے سامنے پڑھیں اور وہ اس کے دل میں نشتر کی طرح اُتر نہ جائے۔ لہٰذا اگر ان اشعار کو خلوص اور صداقت سے بیگانہ مان لیا جائے تو یہ بتانا ممکن نہ ہوگا کہ ان میں دل کے "تاروں کو چھو لینے والی کیفیت" کہاں سے آئی۔ غرض کہ بعض اوقات "بادہ و ساغر" کے پردے بھی خلوص اور صداقت کو مجروح نہیں کرتے۔ در اصل کلام میں خلوص اور صداقت کا پیدا ہونا محض روایتی علامات و اشارات کے عدم استعمال پر منحصر نہیں اس کے لئے ضروری یہ ہے کہ شعر حقیقی جذبات اور سچے تجربات کی ترجمانی کے لئے کہا جائے نہ کہ تخیل کی بلند پروازی اور مینا کاری دکھانے کی غرض سے۔ مومن کے اچھے اشعار کے متعلق خلوص اور صداقت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا مگر چونکہ ان کے بیشتر کلام میں تخیل بے راہ رو تخیل کی کارفرمائی زیادہ ہے اس لئے ہر دیانتدار نقاد پر یہ اعتراف واجب ہے کہ مومن کے زیادہ تر اشعار خلوص اور صداقت سے معرا ہیں۔

وقار عظیم صاحب متذکرۂ بالا دعوے کو مضبوط بنانے کے لئے ایک بڑے پتے کی بات کہہ گئے ہیں۔ آپ بھی اس سے لطف اندوز ہوتے چلیں۔ فرماتے ہیں:۔ "ہمارے غزلوں کے صدہا دیوانوں میں تغزل کی جو شوخیاں، رنگینیاں اور درد اور سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی جو تاثیر اور تڑپ ہے اس میں خلوص بہت کم جگہ ہے۔" میں سمجھتا ہوں کہ تناقض (Self Contradiction) کی اس سے بہتر مثال ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو وقار عظیم صاحب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سب سے پہلے مومن نے تغزل کو رسمی اور روایتی قیدوں سے باہر نکالا اور دوسری طرف وہ مومن کے ان اشعار پر سر دھنتے نظر آتے ہیں ؎

پشیماں آئے ہیں وہ لاش پر اب — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

موئے آغازِ اُلفت میں ہم افسوس — اسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں — ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

کیا تغزل کی رسمی اور روایتی قیدیں محض گل و بلبل، شمع و پروانہ اور ساقی و بادہ کے چند الفاظ تک محدود ہیں۔ کیا محبوب کا

عاشق کی لاش پر آنا اور عاشق کا مرنے کے بعد بھی محبوب کی پشیمانی دیکھ سکنا اور یہ تمنا کرنا کہ "تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے" یا کسی عاشق کا آغاز الفت میں مرجانا اور مرجانے کے باوجود اپنے دل میں یہ خلش محسوس کرنا کہ "اسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی" رسمی اور روایتی باتیں نہیں ہیں؟ کیا مومن کا یہ کہنا کہ چونکہ وہ اپنے محبوب کے خواب ناز میں خلل اندازی پسند نہیں کرتے ہٰذا اپنی "شب دراز" میں کمی نہیں چاہتے محض ادعائے شاعرانہ نہیں ہے؟ — مندرجۂ بالا آخری شعر کے متعلق نیاز فتحپوری کی ایک دلچسپ عبارت یاد آگئی۔ فرماتے ہیں "مومن کا عشق باوجود مادی ہونے کے اس درجہ بلند فتادگی رکھتا ہے کہ وہ اپنی ہر ناکامی کا شکار خود ہی بننا پسند کرتے ہیں اور محبوب سے کوئی مطالبہ ایسا نہیں کرتے جو شانِ عاشقی و محبوبی کے خلاف ہو۔ زمانِ ہجراں میں عاشقوں اور شاعروں کا واویلا خاص چیز ہے لیکن مومن کا ذوق اس باب میں یہ ہے:-

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

اب یہ نیاز صاحب سے کون کہے کہ حضرت! ایک ایسا شخص جس کو صحیح معنی میں عاشق کہہ سکیں، جس کے دل میں واقعی محبت کی تڑپ ہو کبھی اس بات کی تمنا نہیں کرسکتا کہ جدائی کی رات جس کا ایک ایک لمحہ اس کو پہاڑ معلوم ہوتا ہے جلد سے جلد سحر میں تبدیل نہ ہوجائے۔ اور اس لحاظ سے مومن کا وہ ذوقِ بلند جو متذکرہ شعر سے ظاہر ہوتا ہے ایک شاعرانہ ڈینگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس "زمانِ ہجراں میں عاشقوں یا شاعروں کا واویلا" انسانی فطرت کا صحیح اظہار ہے عشق و محبت میں عقل کے مطالبات دل کے تقاضوں پر غالب نہیں آتے۔ وہاں دل کی مجبوریاں دماغ کی وضعداریوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ غالب جیسے انانیت پسند شاعر کو بھی آخر کار کہنا ہی پڑا ؎

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے
دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

مومن کی جس خصوصیت پر تذکرہ نگاروں، اُردو ادب کے مورخوں اور نقادوں نے سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ اُن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی ہے۔ چنانچہ اُردو شاعری میں جس طرح میر اپنے سوز و گداز، درد اپنے متصوفانہ رنگ اور غالب اپنے مفکرانہ انداز کے لئے ضرب المثل ہیں، اسی طرح مومن بھی اپنی نازک خیالی اور معنی آفرینی کے لئے خاص طور پر مشہور ہیں۔ مومن کو خود بھی اپنی خصوصیت پر ناز تھا ؎

اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے کہاں ہے لیک معنی بند و مضمون یاب اپنا سا (باقی)

نظیر صدیقی

"من و یزداں" کامل

صرف آخر جولائی تک

قیمت میں خاص رعایت

کا دوسرا اڈیشن طیار ہے

یکم جولائی ۵۳ء سے اس کی روانگی شروع ہو جائے گی، جن حضرات نے پہلے آرڈر دئے تھے وہ مکرر اطلاع دیں ورنہ تعمیل نہ ہوگی۔

اس کی قیمت علاوہ محصول سات روپیہ آٹھ آنے ہے، لیکن جن حضرات کے آرڈر ۳۱ جولائی تک آجائیں گے انھیں علاوہ محصول چھ روپیہ میں مل سکے گی۔ جولائی کے بعد یہ رعایت غالباً ختم ہوجائے گی۔ منیجر نگار

اِدھر اُدھر سے

آگ بجھانے کا نیا طریقہ اس وقت کہیں آگ لگ جاتی ہے تو سب سے پہلے پانی کی طرف خیال جاتا ہے اور پھر یہ کہ گھر کے آدمیوں اور مال و اسباب کو باہر نکال دیا جائے تاکہ وہ آگ سے محفوظ رہیں، لیکن ان دونوں باتوں میں جن جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور اسی لئے حکومتوں نے آگ بجھانے والوں کا ایک محکمہ ہی الگ کر دیا ہے۔

اول تو یہی مشکل ہے کہ آگ لگنے کی اطلاع فوراً اس محکمہ کو پہونچ سکے اور اگر پہونچ بھی جائے تو یہ توقع رکھنا کہ بغیر کسی توقف کے آگ بجھانے والے فوراً موقع پر پہونچ جائیں گے، غلط ہے۔ یہ شکایت ہندوستان ہی نہیں بلکہ مغربی ممالک میں بھی ہے کہ آگ بجھانے والے بہت تساہل سے کام لیتے ہیں (چنانچہ بعض فلموں میں ان کی اس سہل انکاری کا خاکہ بھی اُڑایا گیا ہے)۔

آگ جس تیزی سے پھیلتی ہے، اتنی ہی تیزی سے اس کو بجھانا واقعی مشکل ہے، اول تو گھروں میں ہر وقت اتنا پانی موجود نہیں رہتا کہ وہ کافی ہوسکے دوسرے یہ کہ اگر کنوؤں اور نلوں سے حاصل کیا جائے تو اس میں بہت دیر لگ جاتی ہے اور آگ کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے، اس لئے آگ بجھانے والے اپنے ساتھ پائپ، سیڑھیاں، جال وغیرہ بھی لاتے ہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ پانی بیک وقت حاصل کرسکیں اور جن لوگوں کی جان خطرہ میں ہے ان کو باہر نکال سکیں۔ الغرض آگ بجھانے کے جو طریقے اس وقت رائج ہیں وہ بہت ناقص ہیں اور اسی لئے دنیا کو ہر سال آتشزدگی سے جان و مال کا کافی نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔

اس مسئلہ پر سائنس داں عرصہ سے غور کر رہے تھے کہ پانی کے علاوہ اور دوسرے زیادہ موثر طریقہ آگ بجھانے کے کیا ہوسکتے ہیں اور آخرکار ایک امریکی ماہر "ڈیل آک" اس گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے ثابت کر دیا کہ آگ بغیر پانی اور گیس کی مدد سے بھی گھر بیٹھے بجھائی جاسکتی ہے، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جو طریقہ اس نے دریافت کیا ہے وہ اس قدر عجیب و غریب ہے کہ ذہن انسانی اس طرف کبھی منتقل ہی نہ ہوسکتا تھا یعنی اس نے اپنے تجربات سے ثابت کر دیا ہے کہ آگ کو مطلق آواز یا ایتھر کی ان موجوں سے بجھایا جاسکتا ہے جو فضا میں آواز سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جب ہم گیس کے چولھوں یا مشعلوں (Burners) کو آواز کی لہروں سے بجھا سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ بڑی آگ کو بھی اس طرح نہ بجھا سکیں۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ اس کے لئے ہم کو فائر اسٹیشنوں پر آواز کی لہریں پیدا کرنے کیلئے بڑے بڑے آلات رکھنا پڑیں گے اور ان کے استعمال کی صورت یہ ہوگی کہ جب کسی جگہ سے آگ لگنے کی اطلاع آئے گی تو اسی طرف یہ لہریں پھینک دیجائیں گی اور آگ بجھ جائے گی، اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے آلات گھروں میں بھی رکھے جاسکتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے معمولی آگ کو فوراً بجھایا جاسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ قدرت کا سب سے بڑا انعام سورج کی گرمی ہے، لیکن ہم اس سے بہت کم فایدہ اُٹھاتے ہیں، حالانکہ بہت سے وہ کام جو آگ کی مدد سے پورے کئے جاتے ہیں محض آفتاب کی گرمی سے پورے ہوسکتے ہیں

اس کا خیال ہے کہ ہم سورج کی گرمی پر بڑی طرح قابو پا سکتے ہیں جس طرح بجلی پر، یعنی اگر ہم بغیر تار کی مدد کے بجلی کو قابو میں لا سکتے ہیں جیسا کہ ریڈیو سے ظاہر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ سورج کی گرمی کو بھی اسی طرح گھر گھر منتقل نہ کر سکیں اور اس کی مدد سے بہت سے گھریلو کام (جیسے کھانا پکانا، استری کرنا وغیرہ) انجام نہ دے سکیں۔

حرارت آفتاب:

سورج میں کیا کیا قوتیں اور کس کس مقدار میں موجود ہیں، ان کا صحیح اندازہ انسانی قوت سے باہر ہے۔ سورج سے جتنی گرمی کرۂ زمین تک پہونچتی ہے وہ اس کی اصل گرمی کا دس کروڑواں حصہ بھی نہیں ہے، لیکن پھر بھی اس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ اس سے محروم ہوجانا گویا زندگی سے محروم ہوجانا ہے۔

اگر آپ دُنیا کے تمام کوئلہ کی سالانہ پیداوار برابر ۵۰ ہزار سال تک جمع کرکے اس کو روشن کریں تو ہم کرۂ ارض پر ۹۰ فٹ کی منجمد برفیلی تہ کو ایک سال کے اندر پگھلا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گرمی یا حرارت کی بہت بڑی مقدار ہے، لیکن سورج سے جو گرمی ہم کو ہر وقت حاصل ہوتی رہتی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے، حالانکہ سورج کی اصلی حرارت سے اسے ذرہ و آفتاب کی بھی نسبت نہیں

اس مسئلہ پر آرخمیدس اور پلوٹارک کے زمانہ سے غور رہا ہے۔ لیکن عملی حیثیت سے اول اول اٹھارویں صدی میں بفون نامی ایک ماہر سائنس نے ایک محدب شیشے کے ذریعہ سے آفتاب کی کرنوں کو ایک نقطہ پر لاکر آگ پیدا کرنے کی کوشش کی اس کے بعد اُنیسویں صدی میں مختلف ممالک کے ماہرین نے اس کا تجربہ شروع کیا، یہاں تک کہ آج یہ بات بالکل ممکن ہوگئی ہے کہ بعض گھریلو کام بغیر آگ کی مدد کے محض سورج کی گرمی سے انجام دے سکیں۔

عملی تجربات کے سلسلہ میں پروفیسر فلکس ٹرمبو نے بہت نمایاں قدم اُٹھایا ہے۔ وہ ایک گاؤں مانٹ لوئی کی تجربہ گاہ میں بہت بڑے بڑے محدب شیشے نصب کرکے آفتاب سے ۴۷۵۴ ڈگری حرارت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ یہ درجۂ حرارت وہ ہے جس میں ۱۰۰۰ پونڈ لوہے کے ٹکڑے کو ایک گھنٹہ کے اندر گلاکر پانی کرسکتے ہیں۔

دھاتوں کے گلانے کے جو اور طریقے مستعمل ہیں ان میں بجلی، تیل اور کوئلہ سے کام لیا جاتا ہے، لیکن اس میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ صرف بہت زیادہ ہوتا ہے، متعدد آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے، دوسری خرابی یہ ہے کہ اس طرح دھات گلانے سے کوئلہ، تیل اور بھٹیوں کے اجزاء بھی دھات میں شامل ہوجاتے ہیں اور ان کو دوبارہ صاف کرنے کی محنت شاقہ برداشت کرنی پڑتی ہے، لیکن اگر یہی کام محض حرارت آفتاب سے لیا جائے تو صرف بھی بہت کم ہوگا اور دھات میں کسی اور چیز کی آمیزش بھی نہ ہوسکے گی۔

ہندوستان میں ایک چولھا اس قسم کا طیار ہوگیا ہے جو سورج کی گرمی سے ہمارے لئے کھانا طیار کرسکتا ہے، لیکن یہ کامیابی کی بالکل ابتدائی منزل ہے، ضرورت ہے کہ سورج کی گرمی سے جو قدرت کا بہت بڑا انعام ہے، زیادہ سے زیادہ فایدہ اُٹھایا جائے۔

دُنیا کا سب سے زیادہ قیمتی فلم

مٹرو گولڈوین کمپنی نے حال ہی میں ایک فلم طیار کیا ہے جو دُنیا کا سب سے زیادہ اہم و قیمتی فلم سمجھا جاتا ہے۔ اس فلم کا نام QUO VADIS ہے جس میں روم کے مشہور ظالم بادشاہ نیرو کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ اس فلم کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کی طیاری میں پورے بارہ سال صرف ہوئے، ۳۲ ہزار لباس طیار کئے گئے، ایک لاکھ ۵۰ ہزار سبزیاں بنانا پڑیں، ۳۰ ہزار اداکاروں نے اس میں حصہ لیا اور ۲۵ لاکھ پونڈ اس کی تکمیل میں صرف ہوئے۔

اس تصویر کی طیاری کے لئے روم ہی کی سرزمین تجویز کی گئی اور وہی اسٹوڈیو حاصل کیا گیا جسے کسی زمانہ میں مسولینی نے ہالی ووڈ کے مقابلہ میں طیار کیا تھا۔

نیرو کے زمانہ کا روم پیش کرنے کے لئے پورا شہر کا شہر انھیں بنانا پڑا۔ اس کے لئے خدا جانے کتنے معماروں، کتنے بڑھئی، کس قدر سنگ تراشوں اور رینٹروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ۳۲ ہزار لباسوں کے لئے ۵۰ ہزار کپڑا خریدا گیا اور اس کے سینے کے لئے ایک درزی خانہ علحدہ قایم کیا گیا۔

صرف اسٹوڈیو سے باہر کے مناظر طیار کرنے کے لئے ۵۰۰ کاریگر لگائے گئے جنھوں نے ایک لاکھ ۵۰ ہزار سین سینری طیار کیں۔ قدیم اہل رومہ جس وضع کے بال رکھتے تھے، اس کے لئے فلارنس کی ہزاروں عورتوں کے بال حاصل کئے گئے تاکہ ان سے تین ہزار طیار کئے جائیں۔

بجلی کا سامان جو ہالی ووڈ سے آگے بھیجا گیا اس کا وزن ۵۰ ٹن تھا۔

نیرو کا ایک دلچسپ مشغلہ یہ بھی تھا کہ وہ ذنگل میں شیروں کے سامنے آدمیوں ڈالدیا کرتا تھا اور شیر انکے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے تھے اس سین کے لئے ۲۳ شیر مختلف سرکسوں سے حاصل کئے گئے اور ہفتوں تک انھیں رومی لباس دیکھنے کا عادی بنایا گیا اس مشق کے دوران میں ایک شیر نے ایک اداکار کو ہلاک بھی کر دیا۔ اس سلسلہ میں ایک اداکار فورا سوئیرن کا بیمہ جسے شیروں کے پاس رہ کر کام کرنا تھا ۶۰ ہزار ڈالر میں کرایا گیا۔

سرکس کے یہ شیر چونکہ صرف گدہے اور خچر کا گوشت کھانے کے عادی تھے اس لئے جب انھیں بغیر راتب دئے ہوئے ڈمی اداکاروں کی طرف چھوڑا گیا تو شیروں نے توجہ بھی نہیں کی، مجبوراً ان پر خچروں کا گوشت مو یا گیا اور اس کے بعد شیروں کے حملہ کا سین مکمل ہوا۔

شاہ نیرو کا محل طیار کرنے کے سلسلہ میں سات ۴۰۰۰ فیٹ کے مجسمے طیار کرکے نصب کئے گئے اور دریائے ٹائبر پر ایک نیا پل طیار کیا گیا تاکہ شہر کی آتشزدگی کے وقت اس پل سے لوگوں کے بھاگنے کا سین دکھایا جاسکے۔

آگ لگانے کے لئے پورا شہر کا شہر انھیں از سرِ نو طیار کرنا پڑا اور ۴۰ ٹینک پٹرول سے بھرے ہوئے آگ لگانے میں خالی ہو گئے۔

فلم کا وہ حصہ جو روز طیار ہو جاتا تھا، انگلستان بھیجا جاتا تھا اور وہاں سے ڈیولپ ہونے کے بعد فوراً واپس کیا جاتا تھا تاکہ ڈائرکٹر اسے دیکھ کر معلوم کرسکے کہ اس میں کوئی کمی تو نہیں ہے۔

تین کتابیں ایک ساتھ

رعایتی قیمت پر

شہوانیات	قولِ فیصل	گوہر
للعہ	۶ /	عہ

صرف چھ روپیہ میں معہ محصول مل سکتی ہیں۔ منیجر نگار

وزیر اعظم پاکستان کے نام

(فضا ابن فیض اعظمی)

کیوں جذب تہِ ریگ ہوئی موجِ گہر ریز ؟
خورشید ترے کیوں ہوئے راتوں پہ رضامند ؟
اے مردِ خرد مند !

مہتاب و کواکب ہیں اسی خاک کی میراث
دریوزہ گری عالمِ افلاک سے "تا چند ؟
اے مردِ خرد مند !

ہر صبح کا سرمایہ ہے اک مہرِ جہانتاب
کس طرح سے بے سوز و تب عشق ہے خورسند
اے مردِ خرد مند !

حاصل نہیں سوزِ ابدی بے نفس گرم
شبنم نہیں کر سکتی شعاعوں کو نظربند
اے مردِ خرد مند !

بے سوز ہوں سینے تو ہیں کردار بھی بیکار
بے لالہ و گل باغ ہے ویرانے کے مانند
اے مردِ خرد مند !

یہ تیرہ نہادانِ قباپوش و خطاکوش،
پیراہنِ آئینہ میں ہیں زنگ کے پیوند
اے مردِ خرد مند !

جل کر بھی ہیں یہ فطرتِ پروانہ سے محروم
"ملّا"، ترے گلخن کے ہیں بس دانۂ اسپند
اے مردِ خرد مند!

یہ دشمنِ ایمان ہیں، کفرانِ بصیرت
یہ بندۂ زر، جاہ و مناصب کے ہیں پابند
اے مردِ خرد مند!

چھڑکی ہے انھیں آئینہ سازوں نے سیاہی
ہیں تیری فضائیں انھیں ذرّوں سے گلہ مند
اے مردِ خرد مند!

بادل ہیں یہ وہ جن سے برستی ہے فقط آگ
آشوبِ ہلاکو سے یہ آشوب ہیں سہ چند
اے مردِ خرد مند!

کتنے گل و نسریں نہیں اس راز سے آگاہ
ہے کس کا لہو لالۂ صحرا کا حنا بند،
اے مردِ خرد مند!

رندانِ قدح خوار پہ بھی گاہے نظر کر
شاید کہ یہی جامۂ ملت کے ہوں پیوند
اے مردِ خرد مند!

ممکن ہی نہیں یہ کہ جگر تشنہ ہوں کانٹے
اور پھولوں کے ہونٹوں پہ ہوں امواج شکر خند
اے مردِ خرد مند!

شہرِ نگار

(پروفیسر شور)

یہ دھوپ اور اس بلا کا سایہ
غربت میں وطن کا دھیان آیا

پردیس نے پھر کیا کچھ ارشاد
اک شہرِ نگار آگیا یاد

وہ خاکِ وفا، وہ مہر کا شہر
ہنس ہنس کے پیا ہے جس کا ہر زہر

وہ شہرِ سرود و ساز و آہنگ
آتشکدۂ چغانہ و چنگ،

رقص و رم و رنگ و نور کی خاک
مضرابِ جنوں خرد کی فتراک

جبریل شکار و کعبہ در دام
میخانے کی شب کنشت کی شام

آتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز
چھڑتے ہوئے تبکدوں کے وہ ساز

سلگے ہوئے ساز دہکے سینے
ہے ہے وہ پگھلتے آبگینے

بربط کی وہ لو وہ چنگ کی آگ
دل میں وہ اُترتے آتشیں راگ

شعلوں سے وہ کھیلتے نواگر
سینوں میں وہ ٹوٹتے سے نشتر

جلوؤں کی سحر، جمال کی رات
تپتے ہوئے دن، سلگتے لمحات

وہ سیم تنانِ برہمن زاد
بُت خانے کا غم، حرم کی فریاد

آنکھوں میں صنمکدوں کی تقدیس
ہونٹھوں کی ہنسی میں درد کی ٹیس

گل پوش و نوا فروش اصنام
زہرہ کا سرود خوابِ خیام

معبد کو رواں بناتِ ناہید
رستوں میں طلوعِ ماہِ خورشید

یونان کی صبح، مصر کی رات
خورشید جمال دیویاں سات

کندن سے بدن کا آتشیں روپ
جلوہ بھی سحر، نقاب بھی دھوپ

آنچل میں چھپی شفق کی لالی،
شانوں پہ گھٹائیں کالی کالی،

قشقہ بہ جبین و گل بگیسو، — بستی کے وہ شوخ و شنگ آہو
معصوم شرارتوں کا ہنگام — آوارہ غزال دام در دام
بدمست جوانیوں کا عالم — بھرپور شباب چست محرم

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

وہ عطر و گل و حنا وہ کاجل — اُڑتے ہوئے وہ سروں سے آنچل
وہ پیرہنوں کی گلفشانی ،، — کھولے ہوئے زلف رات رانی
زلفوں کی مہک ہوا کی مستی — پی جاؤ تو ہر شراب سستی !!
وہ پھول، وہ سبزہ، وہ کنارے — وہ ابر، وہ بوندیاں، وہ دھارے
وہ سرد ہوا کا تیز چلنا — وہ نبض سحاب کا اُچھلنا،
بھیگی ہوئی رات، نم ہوائیں — برکھا کی ہوا وہ سائیں سائیں
وہ ابر، وہ بتکدے کی برسات — وہ رات وہ دوست سے ملاقات
گھنگھور گھٹا، فضا دھواں دھار — اور اُس سے ملیں یہ دل کا اصرار
کہتے تھے یہ راستوں کے سائے — ایسا نہ ہو کوئی دیکھ پائے
آساں نہیں قہقہوں میں جینا، — یہ زہر ذرا سنبھل کے پینا !!
وہ چہرۂ دوست کی اُداسی — پھولوں کی ہنسی کرن کی پیاسی
معصوم محبتوں کا اخلاص، — محتاط نظر کی دعوتِ خاص
زخموں کا نفس نفس سے چھلنا — مل کر بھی نہ ہائے اس کا ملنا !
ہر شام کوئی نیا بہانہ، — چھپ چھپ کے اُسی گلی میں جانا
گلیوں میں گریز آدمی سے، — رستوں میں وہ بھیگنا خوشی سے
جب اُس کے دیار سے گزرنا — سائے سے بھی آدمی کے ڈرنا
ڈرنا کہ زمانہ ڈس نہ جائے — انساں کا زہر ہائے ہائے !
اے کشمکشِ برہنہ پائی، — کس دشت میں مجھ کو کھینچ لائی

اِس رنگ سے ابر چھا رہا ہے
پھولوں کو پسینہ آ رہا ہے!

"گُل و بُلبُل کی سرزمین سے"

(تنویر احمد علوی ایم - اے)

جہاں پھر ڈھونڈتا ہے تیرے ایوانِ معلّٰے کو
تری فردوسِ گم گشتہ کے اُس نقشِ مجلّٰے کو
"کنارِ آبِ رکنا باد و گل گشت مصلّٰے" کو
خموں میں ہاں ترے اب تک مئے دوشینہ باقی ہے
وہی پیرِ مغاں ہے ساغر و مینا ہے ساقی ہے
عمر خیام ہے حافظ ہے سعدی ہے عراقی ہے
یہاں نوشیروانی بھی ہے مزدک کا قرینہ بھی
یہاں زردشت بھی ہے جلوۂ ماہ مدینہ بھی
یہاں آتش کدہ بھی ہے فروغِ طورِ سینا بھی
مگر محفل تری تیرہ ہے، ظلمت ہے دماغوں میں
یہ تیرا خونِ دل جلتا ہے مغرب کے چراغوں میں
"مئے باقی" نہیں اب زہر ہے تیرے ایاغوں میں

جگر بریلوی:

جتنی کثرت ہوئی رعنائی و زیبائی کی
پیاس بڑھتی ہی گئی چشمِ تماشائی کی

جلوۂ حسن نے اک آگ لگادی دل میں
آگ وہ آگ کہ جس نے چمن آرائی کی

گرمیِ شوق کے صدقے غمِ رنگیں کے نثار
ہم جہاں بیٹھ گئے انجمن آرائی کی

اب وہاں صرف بہاروں سے پتہ چلتا ہے
دفن تھی خاک کہاں حسن کے شیدائی کی

کچھ ازل ہی سے تھا کانٹوں کو کفِ پا سے لگاؤ
کیا یونہیں ہم نے جگر بادیہ پیمائی کی

اُٹھتی جاتی ہے جگر حسن کے چہرے سے نقاب
لگ گئی جب سے لگن ہم کو خود آرائی کی

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخئیل، اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں بھی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

(۲) مادئین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اسکے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری شہرت و نیکنامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اسکو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت

ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جدید شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر سرسری نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اُردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نغمہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد فنون ادبیہ و حقیقت نگاری

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا۔ اسکے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

REGD No A488

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا ازبس ضروری ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری، مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جسمیں تقریباً تیس فسانے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و اقتصادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں "مارس ہنڈرسن" کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور انکے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور انکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت دو روپیہ

۵۵ سال کے بعد

یہ کتاب نفسیات عملی پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اسکو ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کرلیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ "زندہ رہنا بھی ایک فن ہے"۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے دو

سالنامہ ۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کیلئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۵۳ء

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے، اس نمبر میں [illegible] کے علاوہ نگار [illegible] مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے قیمت [illegible]